ماہنامہ

قومی زبان

ماہنامہ

قومی زبان

کراچی

فروری سنہ ۱۹۸۳ء

بیاد مرزا اسداللہ خاں غالب مرحوم

جلد ———— ۵۳
شمارہ ———— ۲

قیمت ———— ایک روپیہ پچاس پیسے
سالانہ قیمت ———— پندرہ روپے
بیرون ملک ———— ستائیس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ کراچی نمبر۱
فون: ۲۱۶۱۳۶

فہرست

ادارۂ تحریر
جمیل الدین عالی
سید شبیر علی کاظمی

اداریہ

سن عیسوی کا ماہ فروری ہر برس دنیائے ادب کے نابغۂ روزگار مرزا اسد اللہ خان غالب کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ غالب ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔ ان کے انتقال سے اب تک مرزا کا نام اردو کا وظیفہ اور ادب اردو کا ہمہ وظیفہ بنا ہوا ہے۔ البتہ عقیدت کے اس خصوصی اظہار کے وقت ہم مرزا غالب کی کاوش ترسیل و ابلاغ کو سمجھنے اور اس کو سراہنے پر زور دیتے ہیں کیونکہ مرزا کی شاعری اس خصوصی اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ غالب نے اردو میں تقریباً دو ہزار اشعار یادگار چھوڑے ہیں۔ تقریباً دو سو غزلیں جن میں پچیس ہزار الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ یہ ایک سرسری اندازہ ہے۔ قصائد، مرثیے اور قطعات وغیرہ غزلوں کے علاوہ ہیں۔ غزلیات میں مرزا غالب نے ابلاغ و ترسیل کے تمام طریقے برتے ہیں اور اپنی داخلی کیفیات و تجربات کے موثر اظہار کی تمام ممکنہ صورتیں روبکار لاتے ہیں۔ مرسل اور مخاطب کے معیار کی ناہمواری کبھی کبھی ابلاغ کو دشوار بنا دیتی ہے۔ چنانچہ مرزا غالب سے بھی لوگوں کو یہ شکایت تھی۔ مرزا کی شاعری کی اپنی ایک وضع ہے۔ وہ اپنی باقی اور تاثراتی کیفیت سے زبان و بیان کی ایسی فضا پیدا کر دیتے ہیں کہ ان کے اردو کلام کے بعض حصے انسانی فطرت کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ خود معترف ہیں کہ ؎

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا ‎ ‎ ‎ ‎ ‎ صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

غالب تاریخ کے اس موڑ پر کھڑے تھے جہاں سے انہیں ترسیل خیال کی تمام سطحیں استعمال کرنی پڑیں اور انہوں نے اس کے لیے ایسی علامتیں وضع کیں جن سے اب سائنسی نظریات وابستہ کئے جا رہے ہیں اور بعض مرکبات مثلاً جوہر اضطرار و غبار صدا اور ایجاد صدا وغیرہ علم طبیعیات کی اسمی اکائیاں شمار ہو رہی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ غالب کی شاعری میں مرکبات لفظی کا استعمال عالمانہ، مفکرانہ اور ماہرانہ ہے البتہ وہ اپنے کلام میں مرکب اضافی کو نسبتاً زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ اس مرکب کی ساخت میں افکار کی شدت کے قیام اور خطاب کی تاثیر کو قابل قبول بنانے کی صلاحیت زیادہ ہے یعنی یہ مایۂ خیال کا جزو وقیع اور سرمایۂ افکار کا درخشندہ نمونہ ہوتا ہے۔ تخلیق کی کڑی میں تکمیل کا داعی اور تاثیر وہ میں بے بدل سنگ میل ہے۔

مرزا غالب کے یہاں مرکبات قواعد فارسی و اردو دونوں کے پابند ہیں مگر مرزا نے فارسی ترکیب کو ترجیح دی ہے

مثال کی خاطر ہم اردو دیوان غالب کی ابتدائی دس غزلوں سے مندرجہ ذیل مرکبات پیش کرتے ہیں جو اضافی نوعیت کے حامل ہیں۔ ان دس غزلیات میں ستر اشعار ہیں جو ایک ہزار الفاظ پر مشتمل ہیں فارسی مرکبات اضافی ڈیڑھ سو الفاظ پر محیط ہیں۔ اردو ترکیب کے مرکبات ان کے علاوہ ہیں۔ غرضیکہ ان دس غزلوں کے سرمایۂ لفظیات کا بیس فی صد اس ایک مرکب اضافی کی بندش کا پابند ہے۔

فہرست مرکبات اضافی

شوخیٔ تحریر، پیکر تصویر، جذبۂ بے اختیار شوق، سینۂ شمشیر، دام شنیدن، عالم تقریر، داغ جگر، نقش سویدا، عیش برہنگی، تنگیٔ وجود، سرگشتۂ خمار رسوم قیود، اعتماد دل، آتش خاموش، ذوق وصل، آہ آتشیں، بال عنقا، جوہر اندیشہ طرز تپاک، تشنگی دل، سینۂ بسمل، بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل، دل حسرت، نوآموز فنا، عشق نبرد پیشہ، طلب عرض وفا، اندوہ عشق، نومیدیٔ جاوید، عقدۂ مشکل، نقش وفا، شرمندۂ معنی، اندوہ وفا، جادۂ سر منزل تقوی، کشتیٔ صہبا، زخم تسلی، عمر رفتہ، جنبش لب، حریف دم عیسی، طاق نسیان، بیداد کاوش ہائے مژگاں، خون، تسبیح مرجان، سطوت قاتل، سر و چراغاں، برق خرمن، خون گرم، گرد رہ غربیاں، پرتو نقش خیال یار، افسردہ، تبسم ہائے پنہاں، جادۂ رہ فنا، زخم ہائے راز، بہار نظارہ، جوش بادہ، گوشۂ بساط، گرہ نیم باز، ناساز کاوش غم ہجراں، حباب موجۂ رفتار، نقش قدم، موج بوئے گل وغیرہ۔

اس طرح مرزا کے مایۂ خیال کے تار و پود کا بیشتر حصہ اس اضافی پیچ کا ساختہ پرداختہ ہے۔ ان مرکبات کا برجستہ استعمال سے ندرت کلام ہی آشکار نہیں ہوتی بلکہ شاعرانہ افکار کی قدرت متشکل ہو کر معاصر مفکرین کے لیے چیلنج اور قارئین کی غذائے فکر بھی بن جاتی ہے۔ یہاں لسانیات کا ایک نکتہ پیدا ہوتا ہے کہ تجرباتی معلومات کے مجموعی وجود میں مرکب اضافی فکر شاعر کا مرکز کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مرکب اضافی بالخصوص فارسی ترکیب میں فکر و خیال کے مقصدی جزو کو موثر قطعیت سے پیش کرتا ہے۔ وہ صوتی اکائی بن کر روانیٔ کلام میں خارج نہیں ہوتا۔ مرکب کی اضافت ادا صوت کو تسکین نفس فراہم کرتی ہے۔ مرزا غالب روح لفظ کے رمز شناس اور صوتیات کے رمز سے آشنا تھے۔ انہوں نے مرکب اضافی کو فارسی ترکیب میں واحد اضافت سے نہیں بلکہ تواتر اضافت سے بھی استعمال کیا ہے۔ مرکب در مرکب کا بھی اپنا لسانیاتی تعلق ہے۔ مرزا غالب ماہر لسانیات بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے تجربات کو اردو شاعری کے تار و پود میں قابل اتباع اور مستند بنا کر استعمال کیا ہے۔ ادب عالیہ کے لسانی تیور لوں ہی بنتے اور چمکتے ہیں۔ علم لسانیات دراصل زبان کی مصدقہ معلومات کے مجموعی وجود کے اعتراف کا دوسرا نام ہے۔ ماہرین لسانیات وہ ہیں جو اس وجود سے متعلق مزید معلومات فراہم کرتے ہیں اور ترسیلی سطح پر موثر اور مقبول علامات کو جز و زبان بنا کر اپنی تخلیق کو جزوی یا کلی طور پر امر بنا دیتے ہیں۔ مرزا غالب دنیائے اردو میں اس لحاظ سے اپنا جواب آپ ہیں۔

جملوں کی ساخت لسانی لوازمات کی پابندی اور دیگر مرکبات کا بجا استعمال کلام غالب کو کیوں کر امر بناتے
ہے اس کا تفصیلی جائزہ انشاءاللہ تعالیٰ کسی آئندہ اشاعت میں پیش کیا جائے گا۔

یہ مختصر بیان مرزا غالب کی چند اردو غزلوں کے حوالے سے مرتب ہوا ہے ورنہ مرزا کی علم لسانیات کے صیغہ
ت نویسی کی کاوشیں ایک علمی حیثیت کی مالک ہیں۔ لسانیات اور مرزا غالب ہمارے مطالعے کا ایک نہایت معلوماتی اور
ر آمد باب ہو سکتا ہے۔

ہم اس شمارے میں ان چند مگر اہم اور قدیم نگارشات کو بھی شامل کر رہے ہیں جو مرزا کے انتقال کے فوراً
چھ عرصے بعد ان کے علم و فن کی ستائش میں منظر عام پر آئی تھیں سو سوا سو برس پہلے جو چرچا ہوا وہ آج بھی زندہ
و جوان ہے اور یہی دراصل وہ خراج عقیدت ہے جو بے مثال ہے۔

قارئین قومی زبان سے التماس ہے کہ قومی زبان میں اشاعت کے لیے مضامین ضرور عنایت فرمائیں مگر قومی زبان
مزاج کو ملحوظ خاطر رکھیں۔

انجمن کے ہمدرد اور پرانے کاتب جناب قطب الدین صاحب کا ۷ فروری ۱۹۸۳ء کو کراچی میں انتقال
و گیا۔ ہم دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ بہشت نصیب کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل
عطا فرمائے۔ آمین

قرآن حکیم کی مقدس
آیات اور احادیث
نبوی آپ کی دینی
معلومات میں اضافے
اور تبلیغ کے لیے شائع کی
جاتی ہیں ان کا احترام
آپ پر فرض ہے لہذا
جن صفحات پر یہ آیات
درج ہیں ان کو صحیح اسلامی
طریقے کے مطابق بےحرمتی
سے محفوظ رکھیں۔

"اکمل الاخبار" میں غالب کی وفات کی خبر

"فغاں! آہ زمانہ غدار ہے، و روزگار ناہنجار ہے۔ ہر روز نیا رنگ دکھاتا ہے، ہر دم جام غم و الم میں پھنساتا ہے۔ اس محیط آفت کی موج بلا خیز ہے۔ اس وادی ہولناک کی ہوا فتنہ انگیز ہے۔ اس کا آب سراب اس کی راحت جزو جراحت۔ اس کی رافت سرمایۂ صد آفت۔ اس کی شکر زہر آلود، اس کی امید آرزو سے فرسودہ، ہر روز نخل حیات کو صرصر ممات سے گراتا ہے۔ ہر دم محفل سرور سے صدائے ماتم اٹھاتا ہے ..... پھول ادھر کھلا ادھر گر پڑا لالہ اس رنگینی میں بھی داغ دل پر رکھتا ہے۔ غنچہ خون جگر سے پرورش پاتا ہے۔ بلبل نوحہ گر چمن ہے اور مرغ سحر خواں اسیر محن ....

کیا عجب کہ آسمان درپے آزار ہے۔ بھلا اس سے کیا توقع آسودگی جس کا خود گردش پر مدار ہے۔ دیکھو بیٹھے بٹھائے کیا آفت اٹھائی ہے۔ کس منتخب روزگار کی جدائی دکھائی ہے۔ نخل برومندی معانی کو باد خزاں سے گرایا۔ مہر سپہر سخندانی کو خاک میں ملایا جو خسرو کے بعد ملک سخن کا خسرو مالک تاج تھا۔ اس کا نامۂ عمر طے ہوا۔ جو میدان سخنوری کا شہسوار مالک رکاب تھا۔ اس کا رخش زندگی پے ہوا۔ ان حضرت کی کن کن خوبیوں کا ذکر کیا جائے دریا کوزے میں کیونکر سمائے۔ حسن خلق میں اخلاق کی کتاب اعظم الاشفاقی میں لاجواب، خوبی تحریر میں بے نظیر، صافی ضمیر جادو تقریر، فارسی زبان میں لاثانی۔ اردوئے معلیٰ کے بانی۔ افسوس جس کا شہباز خیال طائر سدرہ شکار ہو وہ پنجۂ گرگ اجل میں گرفتار ہو .... اس غم سے سب کی حالت تباہ ہے۔ روز بھی اس مصیبت میں سیاہ ہے۔ اب توضیح اجمال و تفصیل محال ہے۔ واضح ہو کہ جناب مرحوم دو تین مہینے صاحب فراش رہے ضعف و نقاہت کے صدمے سہے۔ آٹھ دن انتقال سے پہلے کھانا پینا ترک فرمایا۔ اس دنیائے فانی سے بالکل دل اٹھایا تا آنکہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء .... روز دوشنبہ کو دوپہر ڈھلے اس خورشید اوج فضل و کمال کو زوال ہوا ...."

(اکمل الاخبار دہلی ۱۷ فروری ۱۹۸۶۹ء)

غالب کے انتقال پر پہلا مضمون

سید مسعود حسن رضوی

منشی بالگوبند ماتھر نے آگرے سے ایک ماہوار اور رسالہ "ذخیرۂ بالگوبند" کے نام سے ۱۸۶۸ء کی ابتدا میں جاری کیا۔ منشی صاحب دہلی گزٹ پریس آگرے کے دفتر میں کلرک تھے۔ خود ان کا بھی ایک مطبع تھا آگرہ اردو اخبار پریس اور اس کے مہتمم پرنٹر و پبلشر وہ خود ہی تھے۔ یہ مطبع آگرہ کے محلے پیپل منڈی میں واقع تھا۔ "ذخیرۂ بالگوبند" اسی مطبع میں بہت بڑی تقطیع کے ۴۸ صفحوں میں چھپتا تھا۔ اس کا چندہ سالانہ چھ روپے اور محصول ڈاک بارہ آنے تھا ......

اس رسالے کے مارچ ۱۸۶۹ء کے پرچے میں مرزا غالب کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا۔ (یاد رہے کہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو مرزا غالب کا انتقال ہوا) جس کا عنوان ہے "مرزا اسداللہ خاں متوفی المتخلص بہ غالب و نوشہ"۔ غالب کی وفات کے چند روز بعد یہ مضمون لکھا گیا اور غالباً مرزا غالب کے حالات پر یہ پہلا مضمون تھا جو کسی رسالے میں شائع ہوا۔

"یہ شخص شہر دہلی میں ایک بڑا نامی گرامی شاعر فارسی کا تھا۔ اگرچہ اشعار اردو بھی اس کے بہت ہیں مگر زیادہ تر شہرت فارسی میں حاصل تھی۔ ممالک مغربی و شمالی ہند کے پڑھے لکھوں میں کم شخص ہوں گے۔ جنہوں نے اس کے شعر اردو فارسی پڑھے یا سنے نہ ہوں گے۔ کلام میں تخلص اپنا اس نے کہیں غالب اور کہیں نوشہ لکھا ہے اگرچہ نام اسداللہ خاں تھا مگر دہلی اور دیگر اضلاع میں عموماً لوگ مرزا نوشہ کہا کرتے تھے۔

اس کی تحریرات سے واضح ہوتا ہے کہ سلسلہ اس کے خاندان کا افراسیاب بادشاہ ترکستان سے متصل تھا۔ ابتدا میں اس نے اور اس کے بزرگوں نے جو دولت ملکیت اور اختیارات پائے بہ فن سپہ گری و جوہر شمشیر پائے۔ علم فارسی اس نے بامید روزگار تحصیل نہیں کیا تھا۔ اپنے دل ذوق سے سیکھا تھا مگر دلی طبع کے باعث طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی۔ علاوہ ناظم ہونے کے ناثر بھی تھا۔ نثر میں سات کتابیں اس کی تصنیف و تالیف کی ہوئیں زیادہ معروف ہیں اور بہت سی چھپ بھی گئی ہیں۔ نام اور مطالب ان کے یہ ہیں۔ یعنی

۱۔ دیوان فارسی۔ اس میں تخمیناً دس ہزار شعر ہیں

۲۔ دیوانِ ریختہ۔ یہ دیوانِ اُردو نہایت مختصر ہے۔

۳۔ مہرِ نیم روز۔ یہ تاریخ خاندانِ تیموریہ کی نثر میں ابتدائے زمانۂ ہمایوں شاہ سے تا بہ عہد بہادر شاہ خاتم شدہ شاہ دہلی متخلص ظفر ہے۔

۴۔ دستنبو۔ اس میں ایامِ غدر ۱۸۵۷ء کی تباہی اور بربادی اپنی کا حال نثر میں قلم بند کیا ہے اور عبارت میں کوئی لفظ عربی کا نہیں لایا ہے۔

۵۔ پنج آہنگ۔ اس کتاب میں اپنے خطوط دیباچے خاتمے کتب کے اصلاحی محاورے، قواعد فارسی، الفاظ اور عبارت درج کیے ہیں۔

۶۔ اُردوئے معلّیٰ۔ اس صحیفے میں اکمل المطابع واقع دہلی کے مہتمم نے اُردو زبان کے رقعات ان کے جمع کر کے یہ نام رکھا ہے۔ اور انہی کے بیان شاید چھپ بھی رہے ہیں۔

۷۔ قاطع بُرہان۔ بہ تبدیلیٔ درفشِ کاویانی۔ اس میں بُرہان قاطع مشہور کتاب لغت کے مؤلف کی غلطیاں ظاہر کی ہیں۔ لکھا ہے کہ سوائے ان کتابوں کے اور بھی چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور رسالے اُس کے موجود ہیں مگر اس قدر مشہور نہیں ہیں اور نہ ہنوز معرضِ طبع میں آتے ہیں۔"

اس مضمون میں مرزا غالب کے فری میسن کلب کی رکنیت کا تذکرہ بھی ہے اور ان کی مے نوشی اور مے پرستی کا بھی اور پھر ان کی ضعیفی اور اضمحلال کا بھی بالتفصیل بیان ہے۔ اختتام اس مضمون کا یوں ہوا ہے کہ:-

"لکھتے ہیں کہ آدمی اچھا خوش مزاج یارباش خوش طبع خوش انداز، جلیل القدر صاحبِ وضع میں اعلیٰ ملکوں میں نام ور اور شاعر اور منشی قابلِ تعریف تھا۔ دم اس کا بھی غنیمت تھا۔ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا اور ۱۲۸۵ھ میں ۷۳ برس کی عمر پا کر روضۂ رضوان میں جاگزیں ہوا جس نے سنا اُس کے مرنے کا افسوس کیا۔ لیکن جب تک اس کا کلام جو اس نے اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔ روئے زمین پر قائم رہے گا۔ وہ زندہ تصور کیا جاتا رہے گا اور نام اس کا یادگار رہے گا۔ اب ہماری بھی یہی دعا ہے کہ غفور الرحیم اس کی مغفرت کرے۔"

پہلا غالب پرست

محمد قاسم صدیقی

"...... غالب کو غالب بنانے میں جتنا ہاتھ مولانا حالی کا تھا عبدالرحمن بجنوری کا اس سے کم نہ تھا بلکہ اگر سچ پوچھا جائے تو غالب کو نیا غالب دینا بجنوری کا کارنامہ تھا۔ غالب نے جو کچھ کہا تھا اس میں بجنوری کا کوئی اضافہ کرنے کا سوال تو تھا نہیں بلکہ سوال اسے سمجھنے اور سمجھانے کا تھا اور انہوں نے اسے بالکل نئے ڈھنگ سے سمجھنے کی ضرورت کی بقول رشید احمد صدیقی۔" اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب کو نفسیاتی اسلوب تنقید کی روشنی میں پہلے پہل بجنوری مرحوم ہی نے پیش کیا۔ یہ بجنوری مرحوم کے مقالے کا تصرف ہے کہ آج کل کے پڑھے لکھوں میں غالب سے شیفتگی پیدا ہوئی اور اربابِ ذوق و فکر نے غالب ہی نہیں بلکہ دوسرے شعرا کو بھی بجنوری مرحوم ہی کے اندازِ تنقید سے جانچنا اور پرکھنا شروع کیا۔

"محاسنِ کلامِ غالب" کے پہلے جملے سے ہی غالب پرستی کا اعلان ہو جاتا ہے "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید اور دیوانِ غالب"۔ بجنوری نے دیوانِ غالب کو الہامی کتاب مان کر غالب کے اس مصرع کی تردید کر دی۔

مصرع: تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا!

بجنوری کو بادہ خواری کے باوجود غالب کی ولایت میں شبہ نہ تھا۔ انہوں نے اپنے لیے ایک الگ راہ اختیار کی تھی یہ اندازِ فکر خود چونکا دینے والا ہے۔ خواہ ان کے نقطۂ نظر سے اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن ان کے خلوص سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قاضی عبدالغفار نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"محاسنِ کلامِ غالب" کے متعلق عبدالرحمن بجنوری مرحوم نے اپنا جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اگر اس سے بعض نقاد فنی اختلاف بھی کریں تب بھی وہ بجنوری کی وسعتِ نظر اور عالمانہ اندازِ تنقید کا وزن ضرور محسوس کریں گے۔

بجنوری نے اگر دیوانِ غالب کو الہامی کتاب مانا تو بے جا نہیں۔ اس لیے کہ ان کا خیال تھا اور صحیح تھا کہ "کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں۔ کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں"۔ اور اسی لیے انہوں نے غالب کو "رب النوع" تسلیم کیا ہے۔

غالب پر ان کا یہ دیباچہ جو بعد کو "محاسنِ کلامِ غالب" کے نام سے شائع ہوا غالب کے سلسلے میں سب سے اہم دستاویز ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری ۱۸۸۲ء میں سیوہارہ (ضلع بجنور) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد خان بہادر نور اسلا[م]
[کوئ]ٹہ میں انجینیر تھے۔ اس لیے اُن کی پرورش کوئٹہ ہی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بھی کوئٹے ہی میں ہوئی پرورش انگریزی ماحول
میں ہوئی اور بنیادی مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی پڑھائی گئی۔ لیکن اصل تعلیم علی گڑھ میں شروع ہوئی۔ جہاں
[دی]نی تعلیم کے ساتھ ساتھ "علی گڑھ" میں پوری پوری دلچسپی لی۔ شعیب قریشی، عبدالرحمن سندھی اور ڈاکٹر سید محمود اُن کے ساتھی
تھے۔ اور اُن کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ علی گڑھ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد بیرسٹری کے لیے انگلستان روانہ ہو گئے
[بجن]وری کو شروع سے انگریزوں سے منافرت تھی۔ بیرسٹری کا امتحان شاندار کامیابی کے ساتھ پاس کرنے کے بعد وہیں
انگلستان میں انگریزوں کے خلاف کام شروع کر دیا۔ چنانچہ اُن کے خلاف ایک سازش کی گئی۔ لیکن اُن کے پاس ایک
ملازم یہودی تھا اُسے اِس سازش کی کچھ بھنک پڑ گئی اِس لیے وہ اِس سے آگاہ ہو گئے اور فوراً فرانس چلے گئے
فرانس میں رہ کر آپ نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے مقالہ لکھا۔ یہ مقالہ جرمنی زبان میں لکھا گیا اور وہیں چھپا
[یہ] مقالہ نقد پر ہے۔

جرمنی سے ڈگری لینے کے بعد وطن واپس آگئے اور مراد آباد میں وکالت شروع کر دی۔ اُس زمانے میں کلام
[غال]ب کا جرمنی زبان میں ترجمہ کیا۔ آپ ایک مرتبہ ترکی بھی گئے۔ وہاں آپ پر جاسوسی کا الزام لگا دیا گیا۔ اور چھ ماہ
[ت]رکی کی جیل میں بند رہے۔

ہندوستان کی آزادی اور دوسرے مسائل پر مہاتما گاندھی سے آپ کی تفصیلی بات ہوئی تھی۔ آپ کو درسگا[ہ]
[علی گ]ڑھ سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اور آپ کا خیال تھا اِس قسم کی کئی یونیورسٹیاں قائم کی جائیں۔ اسی لیے جب یونیورسٹی کا دور
[آ]یا تو ڈاکٹر بجنوری نے ڈیڑھ دن میں ایک اسکیم بنائی اور اپنے دوستوں خاص طور پر شعیب قریشی، عبدالرحمن سندھی اور
ڈاکٹر سید محمود کو شریک کیا۔ پھر یونیورسٹی کے ڈھانچے کو تبدیل کرنے کے لیے جب ایک کمیٹی بنائی گئی تو اس کے سلسلے میں
[م]شاورتی جلسہ ڈاکٹر بجنوری نے امروہہ میں طلب کیا۔

آپ کی غیر معمولی لیاقت کو دیکھتے ہوئے انگریزوں نے آپ کو ڈگری دینی چاہی اس سے اُن کی مُراد یہ بھی تھی کہ وہ ا[نگریزوں]
کے خلاف اپنی آواز کو بند کر دیں۔ لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ نظام حیدرآباد نے بھی خواہش ظاہر کی کہ وہ یہاں آجائیں
لیکن آخر نواب حمید اللہ خاں (بھوپال) نے اپنا اصلاح کار بنا لیا۔ نواب صاحب بھوپال آپ کے کلاس فیلو تھے اور اُن
کی پیشکش آپ ٹھکرا نہ سکے۔ اور بھوپال میں رہنے لگے۔ وہیں دیوان غالب نظر سے گذرا۔۔۔ یہ نسخہ بھوپال کے فوجدار خاں کو
نذر کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً اُس کو پھر سے طبع کرانے کے انتظامات کیے لیکن وہ نسخہ "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے اُن
کے انتقال کے بعد چھپا۔

ڈاکٹر بجنوری کے خطوط کے مجموعے "باقیات بجنوری" اور "یادگار بجنوری" کے نام سے چھپے ہیں جن سے اُس دور پر
کافی روشنی پڑتی ہے۔ اِن دونوں مجموعوں میں مضامین بھی شامل ہیں۔ جو اُن کی جدت طرازی کا نقش ہیں۔
"محاسنِ کلام غالب" میں دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے اور آج بھی غالب پر اتنا کام ہونے کے باوجود اس بات کا اعتراف [illegible]
جا سکتا۔

غالب نمبر شبستان اردو ڈائجسٹ نئی دہلی ۱۹۶۹ء

غالب کا ایک غیر معروف شاگرد

افسر صدیقی

غالب کی شخصیت اور ان کی شاعری کے بارے میں جتنا لکھا گیا ہے وہ اردو کے کسی شاعر کے لئے نہیں لکھا
گیا۔ بے شمار غالب نمبروں کی اشاعت اور غالب پر درجنوں مقالے اس بات کے گواہ ہیں کہ غالب اردو کے سب سے
زیادہ معروف اور سب سے زیادہ محبوب شاعر ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ان کے اردو کلام کا معتدبہ حصہ ایسا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ
طبقے کی زبان پر اس کے اثرات کا نقش دل پر ہے اس سلسلہ میں تھوڑی بہت جو کمی رہ گئی تھی وہ لالہ مالک رام نے
شاگردان غالب لکھ کر اور اسے شائع کر کے پوری کر دی۔ اس کے باوجود کسی نہ کسی گوشے سے ایسا مواد حاصل ہو جاتا ہے جو
اس باکمال شاعر کے کمالات میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔

کئی سال ہوئے میں گلدستۂ تحقیق کا مطالعہ کر رہا تھا یہ گلدستہ جو احمد خاں صوفی بنا گڑھ سے شائع کرتے تھے اپنے وقت میں
بہت معروف تھا اور اساتذۂ وقت کے کلام کا مجموعہ سمجھا جاتا تھا اس میں ایک بزرگ کا کلام چھپا کرتا تھا۔ جو عرشی تخلص کرتے
تھے اور خود کو غالب کا شاگرد لکھا کرتے تھے۔

دو تین دن ہوئے میں ہریانے کے علاقے کے ادبی آثار کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کے لئے کتابوں کو کھنگال
رہا تھا کہ مجھے اس علاقے کے ایک نادر الکلام شاعر مولوی ظہور علی ظہور کا دیوان دستیاب ہوا۔ ظہور روہڑی فتح علی کے لڑکے
کے باشندے اور حافظ عبدالرحمن خاں، احسان شاہ فقیر اور حکیم مومن خاں کے شاگرد تھے۔ سخن شعرا میں ان کے حالات
موجود ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

قصد ستم سے پہلے ہی یاں دم نکل گیا — نکلا نہ ہائے اس ستم ایجاد کی ہوس
گردش ہے مجھے چشم کی مانند ہمیشہ — آوارہ میں گھر میں ہوں، مسافر ہوں وطن میں
سامنے اس کے نکلنے کی نہیں بات ظہور — گھر میں تم بیٹھ کے باتیں ہی بنا جانتے ہو

(سخن شعرا۔ صفحہ ۳۱)

ظہور دہلی میں رہتے تھے وہیں اپنی تعلیم مکمل کی تھی اور وہیں اپنا دیوان مکمل کیا تھا جس میں صرف غزلیات نہیں ہیں متعدد
مثنویاں، قصائد اور دیگر اصناف بھی شامل ہیں۔ ۱۲۸۶ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

ظہور کے تین لڑکے تھے ان میں منجھلے لڑکے کا نام مظہر حق تھا جو ۱۲۵۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا نام تاریخی ہے مظہر عر[شی]

ارسی اور انگریزی زبانوں کے جاننے والے تھے۔ ہندی سے بھی واقف تھے اور اس زبان میں بھی فارسی اور اردو کے ساتھ
ر سخن کرتے تھے ان کے کچھ دوہڑے اور ٹھریاں بھی تھیں لیکن ایک عجیب اطلاع یہ ہے کہ موصوف نے فارسی شعراء کا ایک تذکرہ
ھا تھا جس کا انگریزی ترجمہ اس وقت کے ایک انگریز حاکم نے لندن بھیج کر اچھی خاصی رقم حاصل کی تھی۔

منظہر صاحب مرزا اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد تھے اور ان کے تصنیف کئے ہوئے تذکرے پر انہوں نے اصلاح بھی
ی تھی۔ اصل عبارت یہ ہے۔

ان (ظہور) کے دوسرے خلف الرشید مولوی منظہر حق قدس سرہٗ شریف نے ان کی تصانیف میں سے ایک
تذکرہ شعرائے فارسی کا ہے جس میں سولہ سو فارسی شاعروں کا تاریخی حال اس میں درج ہے۔
مسٹر ڈیگن صاحب بہادر نے جو جنابہ سابق دہلی کے جج اور مولوی صاحب کے شاگرد تھے کمال کوشش
گراں بہا اطراف و جوانب سے کتب طلب فرما کر مولوی صاحب کو مدد دی اور نواب اسد اللہ خان صاحب
غالب نے کہ از بس التفات اپنے تلمیذ رشید پر تھا یعنی مصنف تذکرہ پر تھا تعلیم خاص اول سے آخر تک تذکرہ مذکور
کی عبارت میں اصلاح فرمائی اور اس تذکرے کا ترجمہ جج صاحب موصوف نے بزبان انگریزی انگلستان ارسال
کیا اور وہاں سے کئی ہزار روپے وصول کئے مگر مولوی صاحب کو کچھ بھی نہیں دیا۔

یہ تمام عبارت دیوان ظہور کے آخر میں درج ہے اور زیادہ تفصیل کے لئے اس کا مزید مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ میں نے
طرف غالب کے ایک غیر معروف شاگرد کی نشاندہی اس لئے کر دی ہے کہ ارباب تحقیق اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کرنے
کی کوشش کریں۔

غالب

"صرف غالب ہی ایک ایسے شاعر ہیں جن کی فکر کے تعین میں دشواری ہوگی وہ بڑی پیچیدہ و پر پیچ ہے اس میں مسائل تصوف
بھی ملتے ہیں اور مسائل تصوف سے گریز بھی۔ جبر یا قدر یہ دونوں انداز پائے جاتے ہیں۔ تشکیک اور یقین دونوں موجود ہیں۔
زندگی کا حوصلہ بھی ہے اور زندگی سے مایوسی بھی ہے۔ عشق بھی ہے اور فلسفۂ عشق بھی۔ درد مندی اور الم ناکی بھی پائی جاتی ہے۔
طنز و ظرافت بھی ملتی ہے لہجے کی بھی یہی کیفیت ہے یہ لہجہ کبھی خاص مشفقیہ بن کر ابھرتا ہے کبھی واسوخت تک پہنچ جاتا ہے کبھی بلا کی
سپردگی ملتی ہے اور کبھی غضب کی انانیت، کبھی یہ مرہم بن جاتا ہے کبھی زخم۔ اتنی متنوع اور ہمہ گیر شاعری غالب کی ہے کہ اس کا
احاطہ قطعیت کے ساتھ ممکن نہیں۔ پھر بھی خدا بھلا کرے تنگنائے غزل کا جس نے بڑے حقیقی کوزے میں دریا کو بند کرنے کی کوشش
کی ہے اور یوں بہت سے محدود نویسوں کو یہ موقع ہاتھ آگیا ہے کہ وہ ایک آدھ مضمون لکھ کر اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھیں کہ انہوں نے
غالب پر بحث ختم کر دی ہے حالانکہ مرزا کی شاعری اس زلف کی طرح ہے جس کے بارے میں انہوں نے خود پوچھا ہے۔ ع
کوئی بتاؤ کہ وہ زلف خم بہ خم کیا ہے۔؟"

ادب و آگہی، از پروفیسر مجتبیٰ حسین

غالب ایک آفاقی شاعر

ڈاکٹر سرور اکبر آبادی

مرزا اسد اللہ خاں غالب کا شمار اردو شعر و ادب کی اُن چند مخصوص و عظیم ہستیوں میں ہوتا ہے جو بیک وقت شاعر اور نثر نگار دونوں ہی حیثیتوں سے اپنی مہارت و فنکاری کا لوہا منوائے ہوئے ہیں بزم سخن کے شعراء اور عرصۂ ادب کے اُدباء میں غالب ہی کی شخصیت ایسی ممتاز و نمایاں ہے جس نے اپنی جدت و جودت طبع، معنیٰ آفرینی اور کشف و الہام کا دلوں پر ایسا سکہ جمایا ہے کہ جس کے سبب وہ حلقۂ شام و سحر سے نکل کر ایک زندۂ جاوید شاعر بن گئے ہیں اگر یہ بات نہ ہوتی اور انہیں اپنے کلیم غیب ہونے کا یقین نہ ہوتا تو اتنے ایثاق و ایقان سے وہ اس قسم کے اشعار ہرگز نہ کہتے ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں — غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — زندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

غالب کو رزم و بزم دونوں ہی حیثیتوں سے اس وجہ سے بھی کمال و مہارت حاصل ہے کہ انہیں اپنے آبا کے پیشہ سپہ گری پر بھی ناز تھا اور شاعری کا فطری جذبہ بھی ان کو قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا تھا۔ لہٰذا وہ ان

...ون باتوں پر جتنا بھی فخر و ناز کرتے کم تھا اُن کے کلام سے اس قول کی پوری پوری تصدیق ہو جاتی ہے۔ اُردو میں غالب
...پہلے شاعر ہیں جن کی شاعری ایجاز و دلکشی و دلآویزی معنی آفرینی و اثر پذیری کے ساتھ ساتھ فکر و خیال کا تنوع اور قوسِ
...ح کے رنگ لیے ہوتے ہے۔ اُن کی شاعری کی یہ ایک اہم خصوصیت ہے کہ وہ شعور و وجدان کو جلا بخش کر فہم و
...اک کے لیے نیا در وا کرتی ہے۔

غالب نے اپنی مجتہدانہ شان، تنقیدی شعور اور تخلیقی صلاحیتوں کے سبب شعر و ادب کو بڑی وسعت دی...
...ی بخشی اُن کی معمولی سے معمولی بات کی تہ میں بھی زندگی کی کوئی بڑی ہی اہم حقیقت مضمر ہوتی ہے وہ انسان پہلے ہیں
...شاعر بعد میں انہوں نے شعر گوئی میں بھی اپنے لیے ایک نئی راہ متعین کی اور منزل تک پہنچنے کے لیے خضر علیہ السلام جیسے
...گ رہنما کی راہنمائی بھی قبول نہ کی اور اپنی ہی راہ پر اپنا ہی یہ قول دہراتے ہوئے گام زن رہے کہ ؎

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابندگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

انہوں نے اپنی شاعری کے وسیلے سے بہت سی نئی و نادر اور عجیب و غریب باتوں کا اظہار و ابلاغ کیا ہے
غالب کی نظر میں اُردو نظم و غزل کوئی خاص اہمیت کی حامل نہ تھی بجائے اس کے اُنہیں اپنے فارسی کلام پر
...فخر و ناز تھا۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

کبھی کبھی اپنی اس شاعری پر فخر کرتے ہوئے یہ بھی کہنے لگتے تھے کہ ؎

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

اور یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کے فارسی شعراء میں اُن کا پایہ بہت بلند ہے جس کا اعتراف ایرانی شعراء نے بھی
...ا ہے مگر بعض اوقات وہی چیز جس کی جانب انسان کوئی توجہ نہیں دیتا اُس کی شہرت و عظمت کا اک خاص سبب بن جایا
...تی ہے ایسا ہی کچھ اردو کے "دیوانِ غالب" نے غالب کے ساتھ کیا۔ علاوہ ازیں اُن کی شخصیت کو زندہ رکھنے اور ان
...نثر نگاری کا لوہا منوانے کے لیے صرف اُن کے خطوط ہی کافی ہیں۔ اُن کے احباب و تلامذہ کثیر التعداد تھے جن سے
...ط و کتابت کا سلسلہ جاری رہتا تھا لہٰذا اُن کے خطوط کی شکل میں اُردو کو ایک اچھا خاصہ ذخیرہ مل گیا جس سے
...اردو زبان و ادب کے طرزِ تحریر اور طرزِ بیان پر کافی اثر پڑا مرزا نے ان رسمی و بے تکلفانہ خطوط کو بھی کبھی کوئی خاص
...ہمیت نہ دی تھی اگر اُن کو ذرا بھی یہ محسوس ہو جاتا کہ یہ خط کسی دن اہلِ نظر کی آنکھوں کا سرمہ بنائے جائیں گے تو شاید
...ہ اور حزم و احتیاط برتتے اور سنبھل کر لکھتے مگر انہوں نے تو قلم برداشتہ جس طرح سے عام طور پر خطوط لکھے جاتے ہیں لکھ
...یئے پھر بھی یہ خطوط اُن کے اعلیٰ مذاقِ نگارش، سادگی و شیرینی، حاضر دماغی و بذلہ سنجی اور بے تکلفی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہیں

اُن کا اندازِ تخاطب، لب و لہجہ کا خلوص، محبت و یگانگت مخاطب کو مسحور و مسخر کر لیتی ہے یہی سبب ہے کہ آج جدید
اُردو نثر نگاری میں یہ خطوط اک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اگرچہ مرزا ہی اس روش کے موجد اور خاتم تھے مگر اب
بھی لوگ دانستہ یا نادانستہ اُس طرز و روش کا تتبع کرنے پر بھی فخر محسوس کرتے ہیں۔

غالب صرف محسوسات و تخیلات کے ہی شاعر نہ تھے اُن کے ہاں غور و فکر اور فہم و ادراک کا بھی اچھا خاصہ سامان
ملتا ہے انہوں نے زندگی کو میر کی طرح نامرادانہ نہیں گزارا بلکہ وہ میر کے بالکل بالعکس زندگی کی حقیقتوں کا رمز آشنا
ہونے کے سبب دوسروں کو بھی اس کے رموز و اسرار اور حقائق و دقائق سے آگاہ کرانے کے لیے اس کے گر سمجھاتے
ہیں۔ غالب کی نظر میں زندگی کی نئی نئی اقدار اور نئی نئی جہتیں تھیں وہ اُن چیزوں پر قطعی قانع نہ تھے جو عام لوگوں کو آسانی
سے میسر آجایا کرتی ہیں بلکہ وہ بقولِ حالیؔ خوب سے خوب تر کی جستجو میں سرگرداں رہے اور اپنی دنیا آپ پیدا کرنے
والے اور زندگی سے نبرد آزما رہنے والے لوگوں میں سے تھے اسی لیے وہ کہتے ہیں ؎

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

انہیں معلوم تھا کہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ممکن ہے لہٰذا چند کلیوں پر قناعت کرنا کیا ضروری ہے۔
وہ بظاہر ایک معمولی سی بات کہتے ہیں مگر اس میں بھی بڑی گہرائی ہوتی ہے اور وہ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ؎

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

غالب کے سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اُن کے ابتدائی دور کا کلام بیدلؔ کے رنگ میں ہے لیکن بقول غالب
بیدل کے رنگ میں بھی شعر کہنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ مرزا نے یہ تجربہ بھی کیا ہے وہ تبھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے
کہ ؎ طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا — اسد اللہ خاں قیامت ہے

بیدل کے رنگ میں اُن کے جو اشعار ہیں وہ واقعی نہایت ادق اور مغلق ہیں ایسے ہی اشعار کی ژولیدگی و پیچیدگی
کے باعث بعض ناقدینِ فن نے مرزا پر مہمل گوئی کا الزام بھی لگایا اور گو مگو کی کیفیت سے دوچار ہو کر آخر انہیں
کہنا ہی پڑا ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

اور ناقدریٔ زمانہ سے کبھی یہ عرض کرنے پر بھی مجبور ہو گئے کہ ؎

"کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں"

جب بڑے بڑے قابل و دانشمند لوگ بھی اُن کی مشکل گوئی کا چرچا کرنے لگے حتّٰی کہ حکیم آغا جان عیشؔ نے
بھی ایک طرحی مشاعرہ میں اُن کی مشکل گوئی کی طرف خصوصیت سے یہ کہہ کر اشارہ کیا کہ ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خد...

ے تو مرزا کو بھی عرض کرنا پڑا کہ ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

غالب ایک ایسی متنوع شخصیت اور رنگا رنگ طبیعت کے مالک تھے جس میں ہر ایک کے جذبات واحساسات
عانات و تخیلات اور واقعات و تجربات کی جھلک موجود تھی اُن کے بقول چونکہ سو سال سے پیشۂ آبا سپہ گری تھا۔
یے اُن کے ہاں تیر و تفنگ، شمشیر و سناں، دشنہ و خنجر، اور طاؤس و رباب جیسے الفاظ کا بھی اچھا خاصا امتزاج
آتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اُنہوں نے اُردو شاعری کو نئی وسعت، نادر ترکیبات و تشبیہات، جدید استعارات
نایات اور نوع بہ نوع رموز و علائم سے معمور کر کے اُسے ایک نئی طرز و رنگ اور نئی صورت و آہنگ بخش کر ایک
ذہن اور نیا تخیل عطا کیا یہی وجہ ہے کہ آج سو سال سے زیادہ کا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی فضائے شعر و ادب
ب کے نغموں کے سبب ایک بہار جاں فزا کا نقشہ پیش کر رہی ہے اُنہوں نے سو سال پہلے ہی اس امر کی تصدیق
چکر کر دی تھی کہ ؎

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

ان کے الفاظ و معنی کے طلسم نے لوگوں کو ایسا مسحور و مسخر کر رکھا ہے کہ آج اُن کے بہت سے اشعار ضرب
ثل کی صورت اختیار کر چکے ہیں جو موقع بہ موقع اور محل بہ محل اکثر پیش کیے جاتے رہتے ہیں۔ غالب دراصل روایت
بجائے ولایت کے زیادہ قائل تھے اُنہوں نے دانش و بینش کے ذریعہ شاعری کی ظاہری شکل و صورت میں ہی نہیں
تخیلات و تفکرات میں بھی تغیر و تبدل پیدا کیا اور اپنی جدت و ندرت طبع سے ایک نئی راہ دکھائی اُنہوں نے
قیقت دانو کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا کہ رنج و غم تو عمر بھر کے ساتھی ہیں راحت و عشرت ایک عارضی شے ہے لہٰذا
ہوں نے درد و غم کا عادی و خوگر ہو کر ہی اُس کا علاج جانتے ہوئے کہا کہ ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

زندگی اور اُس کے حقائق پر بھی غالب کی نظر بڑی گہری ہے۔ فلسفہ و تصوف کے مسائل سے بھی وہ بخوبی آشنا
۔ زماں و مکاں اور حیات و کائنات کی باتوں کو بھی وہ شب و روز تماشے کی صورت میں دیکھتے رہتے ہیں اُن کے
سفیانہ نکات ملاحظہ کرنے ہوں تو اُن کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگاہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غالب نے مسائل تصوف کو جس خوبی و برجستگی اور بے تکلفی سے بیان کیا ہے وہ کسی اہل اللہ اور ولی اللہ کا
ہی حق ہے اس کے لیے واقعی وجدان و معرفت اور سلوک طریقت کی منازل سے گذرنا لازمی ہے لیکن مرزا کو قدرت
کی طرف سے وجدان و معرفت کی یہ صلاحیتیں بدرجۂ اتم عطا کی گئی تھیں۔ وہ اپنی حقیقت سے باخبر تھے ورنہ وہ
یہ نہ کہتے ؎

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب نے فلسفہ و تصوف کا گہرا مطالعہ کیا تھا پھر قدرت نے طبیعت کو ہمہ گیری و وسیع النظری اور وسیع القلبی
بھی بخشی تھی لہٰذا اس طرف بھی متوجہ ہونا ایک امر بدیہی تھا۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

غالب کی قادر الکلامی اور نادر الکلامی کی نظیر دوسرے شعراء کے ہاں بہت کم ملتی ہے وہ خودنگر، خودگر، خودگیر
خود بیں اور خود پسند ہیں خود ستائی اور تعلّی کی اکثر مثالیں اُن کے کلام سے مل جاتی ہیں مگر ایسا شاعر شاید ہی کوئی گذرا
ہو خدا کا بندہ ہوتے ہوئے بھی تعمیر خودی میں ہی صفات الٰہیہ پیدا کرنے کی فکر میں غلطاں ہو اور یہ کہنے کی ہمت
رکھتا ہو کہ ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

وہ حالاتِ ارضی و سماوی اور نیرنگیٔ جہاں کو دیکھ کر محوِ حیرت ہیں اور کہہ اُٹھتے ہیں کہ ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

لازم نہیں کہ خضرؑ کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

شوخی، ظرافت، بذلہ سنجی و حاضر دماغی بھی مرزا کی فطرت کا ایک خاصّہ ہے لیکن اُن کی بذلہ سنجی، ظرافت آمیز مزاج بھی بڑا لطیف، نشاط افزا اور پاکیزہ ہے اس میں رکاکت و ابتذال اور واسوختگی و سُوقیت نام کو بھی نہیں یہ وہ کمال ہے جو کسی سنجیدہ شاعری کرنے والے شاعر کو آج تک میسر نہ ہو سکا مگر غالب کی شوخی، بذلہ سنجی اور ظرافت و ظرافت میں بھی یاس و حرماں، محرومی و مایوسی، غمِ دوراں اور غمِ جاناں سب ہی کی آوازِ بازگشت فریاد سنائی دیتی ہے اِس دنیا تو کیا وہ بارگاہِ یزداں میں بھی اپنی شوخی و دانائی کے جوہر دکھائے بغیر نہیں مانتے خداوند تعالیٰ سے شکوہ کرتے ہیں :-

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ایسی جنت کا کیا کرے کوئی
جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
زندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

زندگی اپنی جو اس طرح سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

بذلہ سنجی، ظرافت اور خوش طبعی کی مثالیں دیکھنی ہوں تو یہ اشعار دیکھیے ؎

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

واعظ خود پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
وشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے حق ادا نہ ہوا

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

غالب کی شخصیت اور شاعری دونوں ہی میں بڑی دلکشی و لآویزی ہے تاریخِ شعر و ادب میں اُن جیسے نکتہ سنج و ثاقب النظر لوگ کم ہی ہوئے ہیں اُنہوں نے جملہ اصنافِ سخن کو اپنی منفرد و مجتہد طبیعت سے اک تازہ کاری و لالہ کاری بخشی وہ عاشق میں تلقینِ صبر اور آہ و فغاں سے اجتناب کرنے کا سبق دیتے ہوئے کہتے ہیں ۔

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہوتا
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

دراصل غالب نے اُردو شاعری کو جو جدید اسلوب بخشا ہے وہ قدیم اور جدید دونوں کے درمیان کی ایک کڑی ہے۔ اُنہوں نے قدیم الفاظ کو نئے معنی و مفاہیم اور پرانی سوچ کو نئی اسپرٹ و Approach سے ممزوج و مربوط کر کے اپنے بعد کے آنے والے شاعروں کو بہت سے حکیمانہ و فلسفیانہ خیالات اور مسائلِ تصوف کے حل سمجھائے وہ ایک ایسے آفاقی شاعر ہیں جن کے کلام کا مرکزی موضوع انسان اور انسانیت کی فلاح و بہبود ہے وہ عظمتِ انسانی کے دل و جان سے قائل ہیں۔ اور بتاتے ہیں کہ ؎

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اُن کے اشعار میں اس قدر معنی آفرینی اور لچک ہے کہ وہ آج بھی زندگی کے ہر موضوع کی بخوبی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں اُن کے ہاں جوش و جذبہ، کیف و اثر، رندی و سرمستی، ذوق و شوق سب ہی کچھ ہے جو کچھ اُن کے دل میں وارد ہوتا ہے وہ نہایت بے ساختگی و برجستگی سے اشعار کے قالب میں ڈھال کر پیش کر دیتے ہیں اور وہی مقبولِ عوام بن جاتا ہے ۔

دراصل آج کی شاعرانہ صناعی و فنکاری اور نکتہ سنجی و معنی آفرینی اور تخیل و تفکر غالب ہی کا فیض و ارث ہیں علاوہ ازیں فلسفہ و تصوف کے بہت سے مسائل بھی غالب ہی کی دانش و دُرایت کے مرہونِ منت ہیں۔ برِ صغیر میں اگر غالب جیسا ذہین و فطین اور عظیم و باکمال شاعر پیدا نہ ہوتا تو آج قوم کو اقبال جیسا عظیم مفکر و مدبر اور فلسفی شاعر بھی نہ ملتا جس نے غالب کی شوکت و عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اُس کو خود بھی یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے ؎

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

سجاد علی انصاری

نیرنگ نیازی

سجاد علی انصاری گدیہ ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ مرحوم علی گڑھ کالج کے بہت ذہین طالب علم تھے۔ یہیں سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ سجاد انصاری کو انشائے لطیف کے سلسلہ میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں ادب لطیف کا فلسفی بھی کہا جاتا ہے۔ آل احمد سرور اپنی تصنیف "نئے اور پرانے چراغ" میں لکھتے ہیں کہ ان کے یہاں فلسفہ اور ادب لطیف دونوں کا ایک حیرت انگیز امتزاج ملتا ہے اس بنا پر وہ ادب لطیف کے فلسفی بھی کہے جا سکتے ہیں مگر ان کی رعنائی خیال، آتش بیانی اور ارتعاش رنگین والی سنسنی، مذاق کو الٹنے پلٹنے اور رنگینی سے لطف اٹھانے سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ اپنے اسٹائل کی وجہ سے اہم ہیں۔ مہدی افادی نے آزاد کے متعلق جو فقرہ کہا تھا وہ ان پر زیادہ صادق آتا ہے یہ بھی صرف انشا پرداز ہی ہیں جنہیں کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔"

آزاد کی انشا پردازی سے سجاد انصاری کے انشائے لطیف کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ آزاد کی تحریریں رنگین ضرور ہیں لیکن ان کا موضوع حسن و عشق نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ ان کی انشا پردازی نے ان کی ادبی و تنقیدی تخلیقات کو صدمہ پہنچایا۔ لیکن سجاد انصاری کی تحریروں میں رومانیت ہے۔ ان کی تحریر پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کے ادبی مجلہ "سہیل" میں بھی شائع ہوئی ہیں۔ انشائے لطیف انشا پردازی کے نازک فرق کو بخوبی محسوس کرتے تھے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ انشائے لطیف کا آج کل جو مفہوم عام ہے اس کے خلاف جہاد کرنا صحت منطق کی دلیل ہے ادب لطیف کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس میں صرف کلمات استعجاب اور تاسف (!) کے نشانات کی کثرت ہو یا سطر کی سطر صرف نقطوں سے پُر ہو۔ کوئی داستان معاشقہ اس طور پر پیش کی گئی ہو گویا کسی مریض لطیف کا پرچہ ترکیب استعمال ہے اسے بدمذاقی سمجھئے یا کمزوری۔ آج کل کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ادب لطیف اور جنس لطیف لازم و ملزوم نہیں ہیں۔٭

پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم ادب لطیف کی تعریف یوں کرتے ہیں: "انشائے لطیف کے یہ معنی ہیں کہ آپ کے خیالات اور طریقہ اظہار خیالات یعنی تحریر، دونوں میں ایک مناسبت ہو۔ ان میں جس قدر نسبت ہوگی اتنا ہی آپ کا کمال انشا پردازی نمایاں اور روشن ہوگا۔٭" رشید صاحب اس وقت کے مروجہ ادب لطیف کو پسند نہیں کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ ۱۹۲۶ء میں جب علی گڑھ سے اپنے سہ ماہی مجلہ سہیل کا اجرا کیا تو انھوں نے اس کے پہلے شمارہ کے اداریے میں اعلان کیا کہ اس میں ادب لطیف اس قسم کے مضامین کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ اداریہ ملاحظہ ہو۔

نمبر ۱/۲ - سہیل جنوری ۱۹۲۶ء

"سہیل میں اس قسم کے کوئی مضامین راہ نہ پا سکیں گے جن کو آجکل عرف عام میں ادب لطیف بتایا گیا ہے ادب لطیف اور ٹیگوریت نے سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ اس نے الفاظ کی ایک چیستاں مقرر کر دی ہے جن کے سمجھنے یا ان سے مستفید ہونے کے لئے ضرورت سے زیادہ عقل و دماغ یا رقیق جذبات کی ضرورت ہے۔ یہ صنف انشا ہمارے ان نوجوانوں میں بہت مقبول ہے جو ادب کو صبح بنارس اور شام اودھ تصور کرتے ہیں۔"٭

جس زمانے میں اردو نثر کی فضا پر ادب لطیف کا اثر غالب آ چکا تھا اس زمانے میں کچھ ایسے صاحبان فکر بھی موجود تھے جو اس سیلاب کے خطرناک نتائج سے باخبر تھے جس کا بین ثبوت پروفیسر رشید احمد صدیقی کی تحریریں ہیں۔ انہوں نے نہایت واضح طور پر یہ بات کہہ دی کہ ادب لطیف کو عورت کے متعلق مصنفین کے آورش وادی نقطۂ نظر نے رسوا کیا۔ جنسیت، لمس و لذتیت کی زیادتی نے اس کے رتبہ کو گھٹا دیا۔ عریانی بڑھتی گئی۔ انہوں نے مہدی الافادی کے انشائے لطیف میں عورت کے تصور کے سلسلہ میں اپنی رائے کے اظہار میں بے محابہ کہہ دیا کہ جہاں تک عورت کا تعلق ہے مہدی، شوق کی قمریوں سے مل گئے۔ رشید صاحب کے الفاظ بھی ملاحظہ ہوں۔

"افادی کہیں کہیں تو شوق کی سرحدوں سے جا ملے اور میرا خیال ہے کہ دونوں کی تحریروں میں جہاں تک عورت کا تعلق ہے مراتب جنس کا اتنا ہی فرق ہے جتنا تفاوت زمانے کی بنا پر ہونا چاہیے۔ اگر دونوں کو ایک دوسرے کے عہد میں منتقل کر دینا ممکن ہوتا تو مہدی، شوق بن جاتے اور شوق، مہدی۔"٭

ڈاکٹر عبدالودود خاں اپنی تصنیف "اردو نثر میں ادب لطیف" میں لکھتے ہیں "ادب لطیف کی تخلیقات میں عورت کا تخیل بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان مصنفین کی تحریروں کا خاص موضوع ہے۔ ان لوگوں نے عورت کو سماجی اور جمالیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا اور ان پہلوؤں پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ پہلا موضوع سماجی اور دوسرا جمالیاتی۔ ان سب کا نقطۂ نظر ایک سا ہی ہے معیار میں فرق ضرور ہے اسے صرف سوچنے اور سمجھنے کا فرق کہہ سکتے ہیں عورت کو جس انداز میں پیش کیا گیا وہ عورت کا ایک آورش وادی نقطۂ نظر کہا جا سکتا ہے۔ اس تصور میں ایک قسم کی تلاش و جستجو ہے۔ جذبات کی شدت تخیل کی کارفرمائی اور تصورات کی دنیا آباد ہے اس لئے ان اہل قلم کی تخلیقات کو رومانی بھی کہا جا سکتا ہے پھر بھی ان کی تحریروں سے جمالیاتی عناصر نظرانداز نہیں کئے جا سکتے۔ رومان سے الگ جمال کا جائزہ بھی لینا چاہیے۔ یہ فن کار عورت کی زندگی میں تبدیلی لانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ عورت کو سماج میں ایک بلند مرتبہ عطا کرنا چاہتے تھے۔

مہدی عورت کو کسی سے کمتر نہیں سمجھتے۔ ان کے یہاں بلند نظری ہے وہ عورت کو مرد کے برابر اہمیت دیتے ہیں۔ مہدی عورت کو "چولھے ہانڈی" کے لئے وقف نہیں کرنا چاہتے وہ اسے اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے ہیں تاکہ وہ ترقی کر سکے۔ انہوں نے پردے کی بھی مخالفت کی۔ مہدی نے عورت کو مرد کی اخلاقی قوتوں کا محرک کہا۔ سجاد حیدر یلدرم بھی عورتوں کی تہذیبی و تمدنی ترقی کے خواہاں تھے۔ یلدرم ہندوستانی معاشرے کو ترکی معاشرے جیسا دیکھنا چاہتے تھے انہیں ترکوں کی معاشرت پسند تھی وہ آزادیٔ نسواں کے حامی تھے۔ ان کے خیال میں ترکی تمدن ہی ایک ایسا معیاری تمدن تھا جو قابل تقلید تھا۔ ترکی میں عورتوں کو جو آزادی حاصل تھی وہ اسے پسند کرتے تھے کیونکہ وہاں کے آداب معاشرت سے خاص انس تھا۔

نمبر ۱-۲ سہیل جنوری ۱۹۲۶ء

نیاز بھی عورتوں کو تعلیم دلانے کے حامی تھے۔ لیکن وہ بے پردگی اور آزادی کو اس حد تک پسند نہیں کرتے کہ عورت تفریحی عنصر بن جائے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"تعلیم بے شک عورتوں کے لئے ضروری ہے لیکن اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ بے پردہ ہو کر سوسائٹی کا تفریحی عنصر بن جائے"[1]

اس خط میں ایک جگہ اور لکھتے ہیں۔

"جنسیات سے تعلق رکھنے والی باتوں کو چھوڑ کر آپ تمدنی حیثیت سے غور کریں تو حالت اور زیادہ افسوسناک نظر آئے گی، خانہ داری، تربیت اولاد، اقتصادی نگہداشت ان کی دست گاہ عورت کا حقیقی حسن ہے سو آپ کو اس کا شاید زیادہ دردناک تجربہ ہوگا۔"

مکتوب الیہ پر نیاز یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ خانہ داری اور متعلقہ تربیت عورت کے لئے سب سے زیادہ ضروری شے ہے۔ ان کے خیال میں اعتدال ہے۔ تبدیلی کا احساس ان کے یہاں بھی ہے لیکن یہ تبدیلی آزادیٔ نسواں کے دوسرے حامیوں سے مختلف ہے۔ یلدرم اور مہدی عورت کو مرد کے شانہ بہ شانہ دیکھنا چاہتے ہیں انہیں عورت کی خانگی زندگی سے کوئی سروکار نہیں۔ نیاز کے انقلابی اور جمالیاتی احساس کو دیکھنے اور ان کی رومانیت کا جائزہ لینے کے بعد ہم جب ان کے یہ خیالات دیکھتے ہیں تو تعجب ضرور ہوتا ہے کہ نیاز عورت کے بارے میں دوسرے ادیبوں کے نظریات کا ساتھ نہیں دیتے۔

سجاد انصاری کا شمار بھی جمالیات کے پرستاروں میں ہوتا ہے وہ ادب برائے ادب کے قائل تھے انہوں نے جس زمانے میں لکھنا شروع کیا اس زمانے کے قریب قریب تمام صف اول کے لکھنے والوں کا انداز نگارش جمالیاتی ہے وہ تمام کے تمام حسن کے پجاری اور جمالیاتی اقدار کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ یہ تمام ادب برائے ادب کے قائل تھے اور یہ تحریک کوئی نئی تحریک نہیں بلکہ اس کی جڑیں ماضی میں افلاطون کے دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں[2]۔

افلاطون جس دور میں پیدا ہوا وہ یونان کی تاریخ میں اخلاقیات کا دور کہلاتا ہے اس دور کے یونانی حکماء زندگی کے تمام مسائل کا اخلاقی نقطۂ نظر سے تجزیہ کرنے کے مدعی تھے ان کی نظر میں خیر و شر، حسن و قبح، حق و باطل، غرضیکہ ہر شے کو پرکھنے کے لئے ایک ہی کسوٹی تھی جسے اخلاقیات کہا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ افلاطون کے نظام فکر کا سرچشمہ بھی اخلاقیات ہی ہے۔ افلاطون نے فن کی مذمت جن بنیادوں پر کی ہے اس کی اساس یہ ہے کہ وہ فن کو حقیقت سے دور پاتا ہے لہٰذا اس کی نظر میں وہ حقیقت نہیں بلکہ باطل ہے۔ اسی بنیاد پر وہ مطلق طور پر فن کو قابل تحقیر و مذمت قرار دیتا ہے۔ دراصل "فن" کے سلسلہ میں افلاطون کے اس تصور کا یہ سلبی رخ ہے۔ اس عظیم مفکر نے "فن" کا ایجابی نقطۂ نظر سے بھی تجزیہ کیا ہے اور اس طرح اس نے "فن برائے فن" کے نظریہ کی داغ بیل ڈالی۔ افلاطون کے اس نظریے نے تاریخ جمالیات کے ہر دور میں مختلف مکاتب فکر کو بڑا متاثر کیا۔ یہاں اس سے کوئی غرض نہیں کہ یہ تاثر مثبت انداز کا تھا یا منفی۔ لیکن جونہی انسانی افکار پر اخلاقیات کی گرفت ڈھیلی پڑتی

---

[1] سالنامہ نگار ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۰۸ [2] "تاریخ جمالیات" از ناصر۔ جلد اول۔

ی۔ اس نے زندگی کے ساتھ فن کا بھی ایک اور نقطۂ نظر سے تجزیہ کرنا شروع کر دیا اور بتدریج فن کو اخلاقیات کے دائرے ہ دور کرنے کی ایک تحریک شروع کر دی جو "فن برائے فن" کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ تحریک جو "فن برائے زندگی" کی تحریک کا قدرتی عمل ہے اپنے اندر لاابالی مزاجوں کے لئے نہایت دلچسپی اور کشش کی تمام رعنائیاں رکھتی تھی اس لئے اس کی مقبولیت کا دائرہ یع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔

افلاطون نے اپنے نظریۂ فن کی بنیاد اخلاقیات پر رکھی ہے لہٰذا اس کا منطقی تجزیہ کیا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فن کو طل نہیں بلکہ حقیقی ہونا چاہئے۔ اس لئے اگر فن باطل ہو گیا تو یقیناً وہ خیر نہیں ہو سکتا بلکہ شر ہو گا جو حیات انسانی کے نشو و نما اور ی کی بقا و استحکام میں رکاوٹ کا باعث بنے گا اور اس طرح انسانیت اخلاق حسنہ جیسے جوہر سے محروم رہ کر گمراہی کی منزل کی ب گامزن ہو جائے گی۔

افلاطون کی نظر میں کوئی فن مقصدیت و افادیت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا یا یوں کہئے کہ کوئی فن بغیر کسی نصب العین و انسانی زندگی کے کسی شعبہ کے اقدار متعین کرنے میں ممد و معاون ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس طرح افادیت و مقصدیت کا رشتہ یت، اخلاقیات اور روحانیات سے بھی ہے لیکن جمالیاتی تنقید کی ستم ظریفی دیکھئے کہ "فن برائے فن" کے مدعیوں نے جمالیات کے قہ افادیت سے اس طرح جوڑے گویا اخلاقیات سے اس کا دور سے بھی واسطہ نہیں۔ فن کی اس بے راہ روی کے خلاف سقراط ر افلاطون نے نہ صرف زبردست احتجاج کیا بلکہ اس کی مذمت اور تحقیر بھی کی ہے۔

سجاد انصاری ادب برائے ادب کے نظریے کی پیداوار ہیں ادب پہلے مذہب کا خادم رہا اس کے بعد اخلاق کا معلم بنا۔ س کے بعد اپنی مطلق العنانی کا اعلان کیا ہی تھا کہ اسے زندگی کی وسعتوں میں گم ہونا پڑا۔ سجاد انصاری نے جو ادبی سرمایہ چھوڑا وہ بہت مختصر ہے۔ کچھ مضامین ہیں کچھ غزلیں اور نظمیں۔ ایک ڈرامہ "روز جزا" کے نام سے ہے جو نامکمل ہے۔ شاعری کی یت سے سجاد کا کوئی نمایاں کارنامہ نہیں۔ مگر ان کے یہاں کچھ اچھے شعر ضرور مل جاتے ہیں ان میں خیالات کی رعنائی بھی ہے اور اظ کی رنگینی بھی۔ مگر ان کا فلسفۂ زندگی، ان کی بصیرت، ان کے مرکزی خیالات سب ہمیں ان کے مضامین میں ملتے ہیں ان کا ڈرامہ روز جزا "نامکمل سہی پر کیٹس (KEATS) کی نظم ہائپیرین کی طرح تکمیل کا احساس دلاتا ہے"[1]

سجاد کے مضامین کی تعداد بہت زیادہ نہیں لیکن ان میں "عفت نسوانی"، "حقیقت عریاں"، "پیام زلیخا"، "مذہب و اق"، "مسلمانان ہند و تحریک" اور "رعنائی خیال" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سجاد کے اکثر مضامین علی گڑھ میگزین میں شائع ہوئے۔

سجاد کے مضامین میں حسن و عشق، شباب، عورت، معصیت لطیف اور عفت نسوانی کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ وہ حسن کے دی اور جمالیاتی اقدار کے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں ان کے نزدیک ارتقائے انسانی کی آخری منزل عورت ہے لیکن ہر عورت ۔ حسن کائنات کا ایک لطیف راز ہے ہر عورت فطرتاً زلیخا ہے۔ شباب، انسانیت کے خلاف ایک علم بغاوت ہے۔ سجاد کی یروں میں جمالیات کی جھلکیاں ہر مقام پر ملتی ہیں وہ محبت کی ماہیت "عشق" کے تحت لکھتے ہیں۔

---

[1] نئے اور پرانے چراغ۔ از احمد سرور

"میں محبت صرف اس لطیف جذبہ کو کہتا ہوں جو ایک حسن پرست دل میں صنفِ لطیف کی کشش سے پیدا ہو جاتا ہے۔ جنسیات کی باہمی کشش میں کوئی رازِ لطیف پوشیدہ ہے اسے محبت کہا جائے یا حسن! مفہوم ایک ہی رہتا ہے"[1]

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں۔

بے وقوف انسان محبت کی دنیا میں اخلاقیات کے وہی مروجہ اصول ضروری سمجھتا ہے جو روزمرہ کے طرزِ معاشرت میں جو روز مقرر ہیں اس کا خیال ہے کہ وفا بھی ایک اخلاقی فرض ہے اور ترکِ وفا ارتکابِ جرم۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ کیفیات اور احساسات میں اخلاقی فرائض کا سوال بے معنی ہے۔ تمام اضطراری کیفیات میں تلون اقتضائے فطرت ہے۔ استقلالِ محبت کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جس کیفیت میں شانِ تلون نہ ہو وہ محبت ہی نہیں۔"

سجاد کی نظر میں:

"ایک عالمِ نفسیات "عشق و محبت" سے صرف اس لئے متنفر ہے (حالانکہ نہیں) کہ ان جذبات کی بنیاد کثیف خیالات ہیں جو کبھی براہِ راست ظاہر ہوا کرتے ہیں اور کبھی وجدانیت کے حیلے سے' اس "ماہیتِ نفسی" سے کس طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔

بوس و کنار کے لئے یہ سب فریب ہیں
اظہارِ پاکبازی و ذوقِ نظر غلط"

سجاد انصاری کا ذوقِ سلیم خشک اور بے کیف تخلیقات کا متحمل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام تحریریں رنگینیوں اور لطافتوں سے معمور ہیں وہ زہد تقویٰ کے قائل نہیں ان کی دانست میں عورت کو زہد و تقویٰ کا مجسمہ بنانے کی کوشش خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے ان کی نظر میں عورت کے لئے شباب اور شباب کی نیرنگیاں ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

"ارتقائے انسانی کی آخری منزل عورت ہے لیکن ہر عورت نہیں۔ عروجِ نسوانی کے بھی مدارج ہیں۔ اگر وہ ان سے گذرتی ہوئی آخری منزل تک پہنچ گئی ہے وہ حقیقی معنوں میں عورت ہو جاتی ہے یعنی انبساطِ شباب کا ایک مجسمہ جس کی ہر کشش اپنے دامن میں کائنات کے لئے ہزاروں برکتیں رکھتی ہے۔ لیکن اگر وہ اس منزل پر ٹھہر گئی جہاں اس کی ظاہرا جسمانیت نے ٹھہرایا تھا اور اس کی کوتاہ نظری اور بدنصیبی نے اسے ان رموز کو سمجھنے سے باز رکھا جو خود اس کی ہستی میں مضمر ہیں وہ ایک نہایت خطرناک وجود ہو جاتی ہے جس کا شباب اور پیرانہ سالی دونوں حیاتِ انسانی کے مہلک ترین دشمن ہیں"[2]

وہ اس پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ علانیہ کہتے ہیں۔

"ایک ناعاقبت اندیش گروہ چاہتا ہے کہ عورت زہد و تقویٰ کی دیوی بن جائے جو حسن و شباب کی نیرنگیوں اور انسِ محبت کے ہنگاموں سے اسی طرح متنفر ہے جس طرح زاہدِ خشک عقل و فراست سے متنفر رہتا ہے۔

[1] محشر خیال۔ صفحہ ۲۷-۲۶ — [2] عفتِ نسوانی' محشر خیال صفحہ ۴۱

جاہل انسان اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ زہدِ خشک انسان نما حیوان ہی پر کھلتا ہے۔ یہ آہنی زنجیر عورتوں کے جسمِ لطیف کے لئے کسی طرح موزوں نہیں۔ عورت کا اگر کوئی فرض ہے تو وہ صرف یہ کہ وہ ہمیشہ عورت رہے۔ جن فرائض سے اس کی نسوانیت کی تکذیب ہوتی ہو اسے کسی صورت سے ان کا پابند نہ ہونا چاہئے"[1]

سجاد انصاری کے نزدیک عرفانِ حسن کے لئے حسنِ لطیف کی ضرورت ہے ان کا کہنا ہے کہ یہ وہ حسنِ ملکوتی ہے جو کبھی کبھی شباب کی نیرنگ خیالوں میں جلوہ گری کرتا ہے حسن اور شباب میں ایک روحانی رابطہ ہے۔ حقیقی نسوانیت صرف عورت کے شباب سے وابستہ ہے وہ دنیا میں پیامِ حسن لے کر آئی ہے اس کا شباب ہی اس کا دورِ پیمبری ہے۔ شباب ہی اس کی نسوانیت کا بھی ضامن ہے۔ ان کے خیال میں زوالِ حسن اور انحطاطِ شباب عورت کی حقیقی زندگی کا نفسِ واپسیں ہے اسے اپنے حسن کا محافظ خود ہونا چاہیے تاکہ شباب کے آخری لمحات تک وہ اپنی ہستی کو رنگینیوں سے معمور رکھ سکے اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو فطرت کی وہ ایک ناقابلِ عفو مجرم ہوتی ہے۔ سجاد کی نظر میں عورت وہ ہے جو محبت کرے اور محبت کرنے دے۔ زہدِ خشک عورتوں کے لئے کسی طرح موزوں نہیں وہ عورت ہی نہیں جو زاہدۂ خشک ہو۔

سجاد انصاری نے عورت کی نفسیات کا بھرپور مطالعہ کیا ہے اور اپنی انشا میں اسے مختلف انداز سے پیش کیا ہے۔ ان کے خیال میں۔

"عورت چاہتی ہے کہ اس کی نسوانیت ساری کائنات کو مسخر کرے' لیکن خود اس کی نسوانیت محض ایک محبت کرنے والے تک محدود رہنا چاہتی ہے۔ اگر کوئی اس کی محبت میں مبتلا ہو گیا' جذبۂ نسوانیت مطمئن ہو جاتا ہے لیکن اس عالم میں عورت کی غیر مطمئن فطرت بغاوت کرتی ہے۔ وہ صرف اس صورت میں مطمئن ہو سکتی ہے جب اس کی آنکھوں کے سامنے ساری دنیا اس کی حکمرانی تسلیم کرے"[2]

بعض مقامات پر سجاد انصاری کی تحریر سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے عورت کا اس قدر قریب سے مطالعہ کیا ہے کہ وہ اس کی ابرو و چشم کے تمام اشاروں سے پوری طرح باخبر ہیں۔ مثلاً جب وہ یہ کہتے ہیں۔

"حسن کی بے باکیاں' حجاب کو حجابِ رنگیں اور حیا کو حیائے سلیقہ بنا دیتی ہے۔ عفتِ گستاخ کا ہر انداز' حسن کو رنگینیوں میں محو کر دیتا ہے۔ اگر بیباکیوں کی جھلک نہ ہو تو شرم و حیا قابلِ نفرت ہو جائے۔ حجابِ نسوانی میں یہ مضمر ہے کہ عورت اپنے حسن و کشش کا پورا احساس رکھتی ہے اور خود اپنی سحر کاریوں کا تماشا دیکھنا چاہتی ہے لیکن رموزِ حسن کو عریاں کرنا نہیں چاہتی"[3]

سجاد نے "پیغامِ زلیخا" کے تحت جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی تخلیقات میں اہم ہے اس میں ان کے فلسفیانہ تفکر کے آثار نمایاں ہیں وہ اس میں زلیخا کے ذکر سے پہلے خیر و شر' انسان و شیطان کی حقیقت اور کشمکش کے اسباب کا تذکرہ کرتے ہیں ان کا طرزِ فکر اور اندازِ استدلال روانی ہے جس کی وجہ سے ان کی تحریر میں حسن اور لطافت پیدا ہو گیا ہے۔

[1] عفتِ نسوانی' محشر خیال صفحہ ۴۴ ' [2] عورت' محشر خیال صفحہ ۱۱۷ ۔ [3] عورت' محشر خیال صفحہ ۱۱۹

سجاد انصاری کا کہنا ہے کہ شیطان، اپنی شیطنت کو خیر کے مقابلے کے لئے بھیجتا رہتا ہے۔ خلیل و کلیم پیغمبر تھے نبرد آزمائی کے لئے نمرود اور فرعون کو منتخب کیا گیا۔ یہ پیغمبر شر تھے۔ خیر کے مقابلے میں شر کو یعنی شیطان کو اپنے عزائم میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی لیکن سجاد شیطان کی اس ناکامی کو ناکامی تسلیم نہیں کرتے وہ جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں وہ نہایت دلچسپ ہے۔

"واقعات کی منطق کا تقاضا تو یہ تھا کہ جس طرح سب سے پہلے پیغمبر کو سب سے پہلے شیطان نے شکست دی تھی۔ اسی طرح نمرود و فرعون بھی خلیل و کلیم پر غالب آجاتے۔ لیکن یہ نہیں ہوا۔ نمرودیت بھی مغلوب ہو گئی اور فرعونیت بھی۔ بظاہر یہ نتائج حیرت انگیز ہیں لیکن اگر اس مسئلہ پر ذرا غور کیا جائے کہ فطرت خیر روز بروز قوی تر ہوتی جاتی تھی اور فطرت شر بے نیاز تر، ان مسلسل فتوحات کا راز خود بخود افشا ہو جاتا ہے۔ شیطان اپنی اس فتح سے جس نے آدم اور آدمیت کو ہمیشہ کے لئے کمزور کر دیا ہے مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ امام خیر کی پہلی شکست نے انسان کو قطعی طور پر مفتوح کر لیا ہے اس لئے اب اس کی ضرورت نہیں کہ ہر پیغمبر کے لئے شیطنت کی مسلسل قوتیں ضائع کی جائیں۔ شیطان کبھی اپنی قوتوں کو رائیگاں نہیں جانے دیتا۔ اس کی پہلی فتوحات نے اسے ہمیشہ کے لئے مطمئن کر دیا ہے۔ وہ انسانوں سے قطعی بے نیاز ہو گیا ہے"[1]

سجاد کے نزدیک شر دو قسم کا ہے ایک "شر قبیح" اور ایک "شر لطیف"۔ نمرود اور فرعون کے سلسلہ میں ان کا کہنا ہے کہ وہ "شر قبیح" کی نمائندگی کرتے ہیں اور وہ زلیخا کو وہ شر لطیف کا پیکر کہتے ہیں جو خیر لطیف، یعنی حضرت یوسفؑ کے مقابلے کی تھی۔ سجاد کی شوخی ملاحظہ ہو کہ وہ کس طرح شیطان کی خوش مذاقی کی توجیہہ کرتے ہیں۔

شیطان کی خوش مذاقیوں کی یہ انتہا ہے کہ ایک خوبصورت پیغمبر کے لئے جس حریف کو منتخب کیا، نسوانیت کا وہ مجسمہ لطیف تھا جس کے ہر انداز میں کائنات کے ہزار ہا طلسم پوشیدہ تھے[2]

سجاد "زلیخا" کے کردار سے فائدہ اٹھاتے ہیں وہ اسے "شر لطیف" کہنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس پردے میں وہ عورت اور عورت کی نفسیات کو بھی بڑی لطافت سے جلوہ گر کرتے ہیں ان کی نظر میں "زلیخا" کا کردار عورتوں کے لئے ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ عورت ایک ایسی بے پناہ قوت ہے جو فرشتوں سے مرعوب ہوتی ہے نہ پیغمبروں سے۔ جب وہ یہ محسوس کر لیتی ہے کہ اس کی نسوانیت مجروح ہو رہی ہے اور اس کے وقار کو صدمہ پہنچایا جا رہا ہے تو پھر وہ کامیابی و ناکامی کے تصور سے بالاتر ہو کر اپنے مقابل شخصیت کی حریف بن جاتی ہے۔ حضرت یوسفؑ کی شان بے نیازی نے زلیخا کی نسوانیت کو مجروح کر دیا تھا اس لئے وہ ان کی حریف بن کر مقابل پر آگئی۔

ڈاکٹر عبدالودود خان اپنی تصنیف "اردو نثر میں ادب لطیف" میں لکھتے ہیں کہ ادبیات میں جس "نازک خیالی" کی ضرورت میر ناصر علی اور مہدی افادی نے محسوس کی تھی وہ سجاد انصاری کے یہاں موجود ہے۔ یوسف بھی آزمائش میں مبتلا کئے گئے تھے اور ابراہیم بھی۔ دونوں کی آزمائش بھی فرق ہے۔ یوسف کی آزمائش "لطیف ترین" آزمائش تھی۔ سجاد انصاری نے دونوں

---

[1] پیام زلیخا - محشر خیال صفحہ ۵۵ [2] پیام زلیخا، محشر خیال، صفحہ ۵۹

پیغمبروں کی آزمائش کا تقابل کیا اور اس حسن کارانہ انداز میں کہ اگر اسے "لطیف ترین تقابل" کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

"خدا نے پیغمبروں کو مختلف مصائب میں مبتلا کیا اور مختلف طریقوں سے ان کی آزمائشیں کیں۔ لطیف ترین آزمائش یہ تھی جس میں یوسفؑ مبتلا ہوئے۔ یہ معجزہ بھی دلآویز ترین معجزہ ہے کہ خوبصورت پیغمبر بالآخر حسن و شباب کے طلسم رنگین سے فاتحانہ انداز سے نکل آیا۔ خلیلؑ آتش نمرود سے اپنے دامن میں پھول لے کر نکلے تھے یوسفؑ کے دامن میں بھی پھول تھے اور ان کا دامن محفوظ تھا۔ یوسفؑ چمنستان حسن سے نکلے، جس دامن میں پھول تھے وہ چاک تھا۔ چاک دامانی سے گل چینوں کا تخیل لطیف تر ہو جاتا ہے"[1]

چمنستان حسن سے نکلنے والے چاک داماں یوسفؑ کے کردار کو کامیابیوں کے پھولوں سے بھرا ہوا کہنے کے بجائے چاک دامن میں پھولوں کے تصور نے ہی یقیناً خیال کو دلکش اور حسین بنا دیا۔

سجاد انصاری نے جس طرح محبت، حسن و عشق، دنیا، انسان، فرشتے اور شیطان کی حقیقت کو ایک اچھوتے اور اپنے منفرد انداز میں پیش کیا اسی طرح مذہب و اخلاق پر بھی انہوں نے نہایت بانکپن سے قلم اٹھایا اس موضوع کے لئے انہوں نے بابی تحریک سے وابستہ ایک مشہور و معروف پیکر جمیل قرۃ العین کا انتخاب کیا ہے

دنیا کے تمام مذاہب نے گناہ سے دور رہنے کی تلقین کی ہے۔ سجاد انصاری کی منطق موشگافیوں نے اس میدان میں بھی ایک لطیف پہلو تلاش کر ہی لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ گناہ کو ممنوع اور کار خیر کو فرض قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر انسان گناہ کی لطافتوں سے لطف اٹھانے کا خیال نہیں رکھتے۔ انسان کی بد سلیقگی سے معاصی کی لطافتوں کے "رسوا" ہونے کا امکان تھا انہوں نے قرۃ العین کی زندگی اور موت پر جس رومانی انداز سے اپنے خیالات کو سپرد قلم ہے وہ کسی صورت میں دلچسپی سے خالی نہیں۔ انہوں نے اس کے قاتل اور اس کے قتل میں "ارباب تضاد و تقدیر" کی مصلحت کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر کے اپنی بے لاگ رائے کا اظہار اس انداز سے کیا ہے کہ نازک خیالی اور لطافت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ لکھتے ہیں:

"اگر ایرانیوں میں مذاق سلیم کی نیرنگیاں اور حسن لطیف کی رنگینیاں ہوتیں تو وہ قرۃ العین کی بربادی کے متحمل نہ ہو سکتے"[2]

انہیں قرۃ العین سے بھی شکوہ ہے جسے وہ یوں پیش کرتے ہیں۔

"قرۃ العین کے مشاغل پر مجھے ایک طرح کا افسوس ہے اسے اپنی ازلی لطافتوں کو مذہب و اخلاق کی بے رنگینیوں پر ہرگز قربان نہ کرنا چاہئے تھا۔ وہ اس سے زیادہ صحیح مشاغل میں اپنی دلفریبیوں کو صرف کر سکتی تھی"[3]

آخر میں وہ قرۃ العین کے قتل کو مصلحت ایزدی قرار دیتے ہوئے اپنے تخیل کو نیا موڑ دیتے ہیں کہ وہ اپنے حسن و شباب کو برباد کر رہی تھی قدرت سے یہ برداشت نہ ہو سکا اس لئے اس دنیا سے اسے اٹھا لیا اس ضمن میں سجاد کے الفاظ ملاحظہ ہوں کہ خدا نے ایسا کیوں کیا۔

---

[2] مذہب و اخلاق، محشر خیال صفحہ ۷۳-۷۴ - [3] مذہب و اخلاق، محشر خیال صفحہ

"وہ حسن کی لطافتوں کا بھی معترف ہے اور شباب کی رنگینیوں کا بھی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا کہ اس مظاہر لطیف کو دنیا والے اس بے دردی کے ساتھ پامال کریں"[1]

سجاد کے مرکزی خیالات سے قریب تر ہونے کے لئے ان کے مضمون "حقیقت عریاں" کا تذکرہ ضروری ہے اور اس کے بعد ان کے نامکمل ڈرامے "روز جزا" کا جو "حقیقت عریاں" کی تفصیل ہے سجاد کے اس مضمون کے مطالعے سے کچھ لوگ اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ لامذہب ہیں۔ آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ "یہ مضمون سجاد کے طرز تحریر کا سب سے اچھا نمونہ ہے۔ اس میں خیالات صاف اور واضح، منطق استدلال، نوکیلا اور منفرد اور انداز بیان ہیرے کی مانند ترشا ہوا ہے لیکن یہ محض حقائق کو الٹنے پلٹنے اور ان کی نئی تعبیر کرنے یا خیال کی تمام پہنائیوں کا احاطہ کرنے کی کوشش ہے۔ اس موقع پر سجاد کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"فرشتے کی انتہا یہ ہے کہ شیطان ہو جائے۔ ایک حقیقت جب پلٹتی ہے دوسری حقیقت ہو جاتی ہے۔ خدا نے ابتدا میں صرف فرشتوں کو پیدا کیا تھا اس وقت تخلیق شیطنت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ خود ملکوتیت میں عناصر شیطنیت مضمر ہیں۔ سلسلۂ ارتقا سے شیطان خود بخود پیدا ہو جائے گا۔"[2]

آگے چل کر کہتے ہیں۔

"انسان صرف اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ ملکوتیت اور شیطنیت دونوں کو ایک دوسرے سے ٹکرانے نہ دے اور جب کبھی تصادم کا اندیشہ ہو اپنی ہستی کو پیش کر دیا جائے"[3]

وہ اس مضمون کا اختتام ان الفاظ پر کرتے ہیں۔

"شیطان کی انتہا یہ ہے کہ فرشتہ ہو جائے۔ جب شیطنیت ملکوتیت سے بدل جائے گی نہ دنیا کی ضرورت رہے گی اور نہ انسان کی"[4]

حقیقت عریاں میں سجاد نے ایسی بہت سی حقیقتوں کو رد کرنے کی کوشش کی ہے جن پر انسان یقین کرتا چلا آ رہا ہے یا جن پر مذہب نے اسے یقین کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ سجاد انصاری کی نظر میں دنیا محض فریب ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"فرشتوں سے یہ کہا گیا کہ نیابت الٰہی کی غرض سے ایک مخلوق پیدا کی جا رہی ہے۔ انسان کو یہ مجبوری تھی کہ وہ ایک مستقل کائنات کا حکمراں ہے۔ خدا جانتا ہے کہ انسان میں جذبۂ ملکوتیت اور جذبۂ شیطنیت دونوں متحرک ہیں۔ اگر وہ عالم بالا ہی میں مقیم رہا دونوں حقیقتیں اسے اپنی طرف کھینچنا چاہیں گی۔ اور وہ کسی نہ کسی طرف کھنچ جائے گا۔ اس وقت اس کی تخلیق کا مقصد ہی باطل ہو جائے گا اس لئے احتیاط اس کی مقتضی تھی کہ اسے کسی دوسری دنیا میں بھیج دیا جائے۔ تخلیق ارض کا باعث یہی ہے۔ نیابت الٰہی کی غرض یہ ہے کہ جس طرح خدا ملکوتیت اور شیطنیت کی کشمکش کو قائم رکھنا چاہتا تھا اسی طرح انسان بھی اپنی ہستی میں اسے قائم

---

[1] مذہب و اخلاق، محشر خیال صفحہ ۲
[2] حقیقت عریاں، محشر خیال صفحہ ۴۹
[3] حقیقت عریاں، محشر خیال صفحہ ۵
[4] " " " صفحہ ۵۵

رکھے۔ انسان الٰہی فرائض کو انجام دے رہا ہے"[1]

سجاد انصاری نے انسان کو بیکراں اعتدال کہا ہے وہ کہتے ہیں کہ انسان نہ حق ہے اور نہ باطل اس کا وجود ایک فریب کائنات سے زیادہ نہیں۔ اس کا وجود فطرت کی اس آسان پسندی کا نتیجہ ہے جس نے ان کی نظر میں فرشتے اور شیطان دونوں کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے ایک بیکراں اعتدال پیدا کر دیا اور یہ اعتدال اصل میں شکست حق ہے اور فتح باطل ہے۔

آخر میں ڈرامہ "روز جزا" کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جو سجاد کی عمر ختم ہو جانے کی وجہ سے ان کی زندگی میں ختم نہ ہو سکا اور نامکمل رہ گیا۔ اس ڈرامے میں سجاد نے قیامت کا منظر پیش کیا ہے جس میں یہ بتلایا ہے کہ آدم، حوا، فرشتے اور شیطان، زاہد و صوفی، خوبصورت مرد اور خوبصورت عورت غرضیکہ سب سے ان کے اعمال کا محاسبہ کیا جا رہا ہے اور ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق انعام و سزا دی جاتی ہے۔ اس ڈرامہ کا مرکزی کردار "شیطان" ہے۔ سجاد اس راز کو فاش کرنے میں جسارت سے کام لیتے ہیں کہ شیطان حسن معاصی کی شریعت کا پیمبر اور خدا کا محرم راز ہے۔ یہ بات ملٹن اور اقبال بھی آسانی سے نہ کہہ سکے۔ مغرب کے حکماء میں ڈانٹے، گوئٹے اور ملٹن نے اور مشرق میں بعض صوفیائے کرام اور اقبال نے شیطان کی شخصیت پر کچھ اشارے ضرور متعین کئے ہیں اقبال نے اپنے "جاوید نامہ" میں اسے خواجۂ اہل فراق کے لقب سے نوازا ہے اور اردو ادب میں اقبال سے پہلے سجاد نے شیطان کو محرم راز کہا ہے۔ سجاد کے بعد فلک پیما اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ رشید صاحب کے آدم کے متعلق ان کے پیش کردہ شیطان کا تصور یہ ہے۔

"ابّی آدم میرے بڑے بھائی تھے لیکن نہایت سادہ لوح، ضدی اور جاہل۔ ذرا کرشمہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ نہ بندوق اپنی، نہ نشانہ اپنا، نہ ارادہ اپنا، نہ مقصد اپنا، صرف اپنے کندھے پر رکھ کر چھوڑ دی۔ یہ نہ سمجھے کہ ان کی اس حرکت سے کتنا بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اب جو کہتا ہوں کہ میاں یہ کیا کیا تو کہتے ہیں کہ ہم خلاصۂ کائنات ہیں۔ میں نے کہا اور میں؟ لال پیلے ہو کر فرمایا۔ شیطان۔

آپ اپنے کو جو کہہ لیجئے لیکن مسئلہ کی نوعیت کھیل کھلاڑی کا پیسہ مداری کا ہے آگے نہیں بڑھتی۔ کھیل کھیلنے پر آپ مجبور ہیں۔ کمال فن پر داد حق ہے اور آپ خوش ہیں کمال آپ کا ہے۔ انسان ایک مقدس گمراہی میں مبتلا ہے جس کو وہ مذہب قرار دیتا ہے اور جس چیز کو نہ وہ سمجھتا ہے اور نہ سمجھنا چاہتا ہے اس کو مذہب کے حوالے کر دیتا ہے۔ میلاد آدم نے قوائے الٰہیہ کو معطل کر دیا تھا۔ انکار ابلیس نے ان کو شگفتہ بنا دیا انکار ابلیس ایک آئینہ تھا جس میں حقیقت نے پہلی بار حقیقت کو پہچانا"[2]

یہاں سجاد انصاری کا اثر صاف نمایاں ہے پاسبان میں شاعر شیطان سے سوال کرتا ہے۔ تمہارا ایمان کس پر ہے۔ شیطان اس کا جواب نہیں دیتا مگر شاعر کا یہ مصرعہ بہت واضح ہے۔

وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم نکلے

---

[1] حقیقت عریاں، از محشر خیال۔ صفحہ ۵۰-۵۱۔ [2] بحوالہ مقدمہ متعلق آل احمد سرور، محشر خیال صفحہ ۲۳

سجاد کا تعلق جمالیات مکتبۂ اظہاریہ تھا جس کا سب سے بڑا علمبردار کروچے تھا۔ وہ کہتا ہے کہ "حسن اظہار ہے"۔ فرائڈ کا اس مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتا ہے وہ کہتا ہے "حسن جنسی خواہش کی تخلیق ہے"۔ کروچے کہتا ہے کہ جمالیاتی عمل داخلی ہے اور اظہار ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ تمثال پیکر کے صفحۂ ذہن پر ابھرنے سے فنی تخلیق کا عمل مکمل ہو جاتا ہے لہٰذا اظہار ہی حسن ہے۔ فرائڈ جنسی جبلت کے اظہار کو حسن کا خالق سمجھتا ہے ہمارے ہاں اقبال بھی اسی نظریہ کے شارح ہیں ان کے خیال میں "فعال انا" حسن کی تخلیق کرتی ہے۔

کبیر داس کی شاعری

توقیر صدیقی

کبیر داس کے والد کا نام نورا تھا اور وہ پیشے کے اعتبار سے جولاہے تھے۔ اس پیشے کا ذکر کبیر داس کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے باوجود تحقیق یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کا صحیح سن پیدائش کیا تھا لیکن اہلِ تحقیق کا اس پر اتفاق ضرور ہے کہ ان کا ظہور پندرہویں صدی میں ہوا ان کے خیالات صوفیانہ تھے۔ اور ان کا درس خدا شناسی اور پریم تھا۔

کبیر داس مذہباً نہ ہندو تھے نہ مسلمان بلکہ ان کا اپنا ایک الگ مشرب تھا۔ لیکن ہندو ان کو گرو اور مسلمان پیر کہتے تھے ان کے ماننے والوں کی تعداد آج بھی لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ ان کی موت سے متعلق ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ جب وہ کاشی گئے تو وہاں ایک روز چادر تان کر سو گئے اور پھر ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور ان کی نعش کے حصول کے لیے ہندو مسلمانوں میں جھگڑا ہوا۔ لیکن جب چادر اٹھائی گئی تو وہاں نعش کے بجائے پھول تھے۔ پس ہندو مسلمانوں نے یہ پھول تقسیم کر لئے۔ ہندوؤں نے یہ پھول بنارس میں لے جا کر جلا دئے اور مسلمانوں نے پھول بگہر ضلع گورکھپور میں دفن کر دئے جہاں ایک روضہ بنا ہوا ہے اور ایک جاگیر بھی اس کے لیے وقف ہے۔

کبیر داس ایک صوفی منش بزرگ تھے اور ان کا مشرب وحدانیت تھا۔ ان کا کلام زیادہ تر تصوف، معرفت، فلسفۂ اخلاق اور دنیا کی بے ثباتی پر مشتمل ہے۔ اور اس قدر پر اثر ہے کہ آج صدیاں گزر جانے پر بھی ان کے دوہے اور بھجن زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ ان کے چالیس دوہے مع ترجمہ پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱)

ھیرا تہاں نہ کھولئے جہاں کنجڑے کی ھاٹ
کس کر باندھو گٹھری اٹھ کر چالو باٹ

ہیرے جواہرات کو فروخت کرنے کے لیے کنجڑے کی دوکان پر مت لے جاؤ کیونکہ وہ صحیح مقام نہیں ہے کنجڑا ہیرے جواہرات کا قدرداں نہیں ہے لہٰذا اپنی گٹھری باندھ لو اور اپنا راستہ لو اور وہاں جاؤ جہاں ہیرے جواہرات کے قدرداں ہیں۔ اسی خیال کو ایک اور شاعر نے یوں نظم کیا ہے ؎

پوچھنے والا جہاں کوئی نہ ہو
اس جگہ کیا آئے کیا جائے

(۲)

گاہک ملے تو کچھ کہوں نا تر جھگڑا ہوئے

اندھوں آگے روئیے اپنا دیدا کھوئے

اگر کوئی خریدار ہو تو اس سے کسی چیز کا مول بھاؤ کیا جائے ورنہ بحث اور جھگڑے سے فائدہ ہی
یا ہے۔ اندھے کے سامنے رونے سے فائدہ ہی کیا ہو سکتا ہے اس سے تو خود اپنی آنکھوں کا نقصان ہوتا ہے

(۳)

کبیر دیکھ کے پرکھ لے پرکھ کے مکھ کو کھول

سادھ اسادھ کر جان لے سن سن مکھ کو بول

کبیر پہلے آزمائش کر اور امتحان میں پورا اترے تو اس سے گفتگو کر ورنہ تعلقات بڑھانا بیکار ہے۔
ے اور برے لوگوں کی خصلت و طبیعت کا اندازہ ان کی باتیں سن کر لگایا جا سکتا ہے۔

(۴)

جب گُن کا گاہک ملے تب گُن لاکھ بکائے

جب گن کا گاہک نہیں کوڑی بدلے جائے

جب ہنر کا خریدار مل جاتا ہے تو مال کے لاکھوں روپیہ مل جاتے ہیں اور کوئی ایسا خریدار نہیں ہوتا تو
ہی مال ایک کوڑی میں بکتا ہے۔

(۵)

ہیرا پرکھے جوہری شبد کو پرکھے سادھ

جو کوئی پرکھے سادھ کو تا کا متا اگادھ

جوہری ہیرے کو اور سادھو آواز اور عمل کو پہچانتا ہے لیکن جو سادھو کو پہچان جاتا ہے اس کی
ل سب سے تیز ہوتی ہے۔

(۶)

برا جو دیکھن میں چلا برا نہ دیکھا کوئے

جب دل کھوجا آپنا مجھ سا برا نہ کوئے

بروں کی تلاش میں جب میں نکلا تو مجھے کوئی برا نظر نہیں آیا اور جب میں نے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھا تو
ھ اپنے سے برا اور کوئی نظر نہیں آیا۔

(۷)

پوتھی پڑھ پڑھ جگ موا پنڈت بھیا نہ کوئے

ڈھائی اچھر پریم کا پڑھے تو پنڈت ہوئے

کتابیں پڑھتے پڑھتے دنیا مر جاتی ہے لیکن کوئی پنڈت یا عالم باعمل نہیں ہوتا۔ یہ تو پریم ہی ہے کہ جس کو تھوڑا
سا پڑھ کر ہی پنڈت یا عالم باعمل بن جاتا ہے۔

(۸)

جا کو راکھے سائیاں مار نہ سکیے کوئے

بال نہ بانکا کر سکے جو جگ بیری ہوئے

جس کا نگہبان خدا ہوتا ہے اسے کوئی نہیں مار سکتا خواہ سارا زمانہ اس کا دشمن ہو جائے۔ اسی خیال
کو یوں بھی نظم کیا گیا ہے ؎

سائیں انکھیاں پھیریاں تو بیری ملک جہان ایک نجریا مہر کی تو لاکھوں کریں سلام

(۹)

کبیرا کا ہوا اس کہیو کان لے گیا کاگ

کان ٹٹول نہ دیکھیا کاگ سنگ رہا بھاگ

کبیر کسی نے کسی سے کہا کہ تیرا کان کوا لے گیا۔ یہ سن کر اس نے اپنا کان تو ٹٹول کر نہیں دیکھا اور کوے کے
پیچھے بھاگنے لگا۔

(۱۰)

ایسی باتیں بولئے من کا آپا کھوئے

اورن کو شیتل کرے آپہو شیتل ہوئے

تو سب سے ایسی باتیں کر کہ تجھ میں تواضع اور انکساری پیدا ہو۔ تو اوروں کو خوش کر تاکہ تیرا دل بھی
خوش ہو جائے۔

(۱۱)

جو تو کو کانٹا بووے تا کو بو تو پھول

تو کو پھول کے پھول ہیں واکو ہیں ترسول

جو تیرے لیے کانٹا بوتا ہے یعنی برائی کرتا ہے تو اس کے لیے پھول بو یعنی نیکی کر کیونکہ تو نے پھول بویا ہے تجھے
پھول ملے گا اور اس نے کانٹے بوئے ہیں اس کو کانٹے ملیں گے۔

(۱۲)

بڑا ہوا تو کیا ہوا جیسے پیڑ کھجور　　پنتھی کو چھایا نہیں پھل لاگے اتی دور

کھجور کی طرح تمہارے بڑے ہونے سے کیا ہوا اگر تم سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچتا کھجور کے درخت کے نیچے مسافر کے
لیے سایہ نہیں ہے اور اس کا پھل بھی بہت دور ہے۔

(۱۳)

روڑا ہوا تو کیا جو پنتھی کو دکھ دیہہ　　سادھو ایسا چاہیے جیسے پیڈے کی کھیہہ

ایسا ڈھیلا (خاک) بننے سے کیا فائدہ جس سے مسافروں کو تکلیف پہنچے۔ سادھو کو ایسا ہونا چاہیے جیسے راستے کی
خاک یعنی انتہائی منکسر و عاجز۔

(۱۴)

کٹل بچن سب سے برا جار کرے تن چھار
سادھو بچن جل روپ ہے برسے امرت دھار

کڑوی بات ایسی بری ہوتی ہے کہ اس تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ نیک آدمیوں کی بات اس ابر کی شل ہے جس
سے آب حیات کی بارش ہونے لگتی ہے۔

(۱۵)

ست سنگ سے سکھ اوپجے ست سنگ سے دکھ جائے
کہیں کبیر تہاں جائیے سادھو سنگ جہاں پائیے

اچھی صحبت سے دکھ دور ہو جاتا ہے اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ جہاں اچھی صحبت ملے وہیں
جانا چاہیے۔

(۱۶)

جہاں دیا تہاں دھرم ہے جہاں لوبھ تہاں پاپ
جہاں کرودھ تہاں کال ہے جہاں چھما تہاں آپ

جہاں رحم سے کام لیا جاتا ہے وہیں دھرم ہوتا ہے اور جہاں لالچ ہوتا ہے وہاں پاپ ہے۔ جہاں غصہ (ظلم) ہوتا ہے
وہاں موت ہے اور جہاں درگزر اور معافی ہے وہاں وہ خود (یعنی خدا) ہے۔

(۱۷)

چاہ گئی چنتا مٹی منوا بے پرواہ　　جن کو کچھ نہ چاہیے سوئی ساھن شاہ

جب خواہش نہیں رہتی اور فکر ختم ہو جاتی ہے تو دل بے پرواہ ہو جاتا ہے کیونکہ جس کو کوئی خواہش نہیں ہوتی وہی
شہنشاہ ہوتا ہے۔ سعدی کہتے ہیں ؎

اے قناعت تو نگرم گردان　　کہ ورائے تو ہیچ نعمت نیست

(۱۸)

میں بھونرا توہیں برجیا بن بن باس نہ لیتے
اٹکے گا کسوں بیل سے تڑپ تڑپ جی دیتے

اے بھونرے میں نے تجھے بار بار منع کیا ہے کہ ہرے بھرے پھولوں سے لدے جنگلوں میں خوشبو نہ سونگھا کر کسی دن
بیلوں میں پھنس کر تڑپ تڑپ کر مر جائے گا۔

(۱۹)

کبیر سنگت سادھ کی جیوں گندھی کی باس
جو کچھ گندھی دے نہیں تو بھی باس سو باس

اے کبیر اچھوں کی صحبت عطر فروش کی خوشبو کی طرح ہے۔ عطر فروش کے پاس بیٹھنے سے اگر وہ عطر نہ بھی دے
تو کپڑوں میں خوشبو بس جاتی ہے۔

(۲۰)

آپ گئی آدر گیا نینن گیا سنیہہ　　یہ تینوں تب ہی گئے جب ہی کہا کچھ دیہہ

خودداری، خاطرداری اور آنکھوں کی مروت یہ تینوں چیزیں اس وقت جاتی رہتی ہیں جب انسان کسی کے
آگے ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔ حالی یوں کہتے ہیں ؎

جانا کسی کے در پہ کسی آرزو کے ساتھ　　دولت یہ خسی ہے بہشت آبرو کے ساتھ

(۲۱)

پنڈت اور مشعلچی دونوں سوجھے ناہ　　اورن کو کرے چاندنا آپ اندھیرا ماہ

پنڈت اور مشعلچی دونوں کو کچھ نہیں سوجھتا۔ یہ دوسروں کو تو روشنی دیتے ہیں لیکن خود اندھیرے
میں رہتے ہیں۔

(۲۲)

ناری کی پرچھائیں پڑے اندھے ہوت بھجنگ
کبیر تن کی کون گتی جو نت ناری کے سنگ

عورت کی پرچھائیں سے سانپ اندھا ہو جاتا ہے۔ اے کبیر ان لوگوں کی کیا گت بنتی ہوگی جو ہمیشہ عورتوں
کے ساتھ رہتے ہیں۔

(۲۳)

پرناری پینی چھری مت کوئی لاگے انگ
دس مستک راون گئے پرناری کے سنگ

پرائی عورت تیز چھری ہے کوئی اس کو اپنے پاس نہ رکھے۔ پرائی عورت (سیتا) کو پاس رکھنے کی سزا میں راون کو اپنے [illegible] سر کٹانے پڑے۔

(۲۴)

پرناری کا راچنا جیون لہسن کا کھان
کونے بیٹھے کھاتے پرگٹ ہوتے ندان

پرائی عورت کو اپنے پاس رکھنا ایسا ہے جیسے لہسن کھانا۔ چاہے کتنا ہی چھپ کر لہسن کیوں نہ کھایا جائے اس [illegible] بو ضرور پھیلتی ہے۔

(۲۵)

چھوٹی موٹی کامنی سب ہی بس کی بیل
بیری مارے داؤں سے یہ مارے ہنسی کھیل

چھوٹی ہو یا بڑی ہر طرح کی حسینہ زہر کی بیل (گانٹھا) ہوتی ہے۔ دشمن تو قریب سے مارتا ہے اور یہ ہنسی [illegible] میں کر مارتی ہے۔

(۲۶)

مورکھ کے سمجھاوتے گیا گانٹھ کا جائے
کوئلا ہوئے نہ اوجلا چاہے سو من صابن لائے

بیوقوف کو سمجھانے میں اپنی عقل بھی جاتی رہتی ہے۔ کوئلے کو چاہے سو من صابن سے دھو ڈالو وہ صاف [illegible] نہیں ہوگا۔

(۲۷)

سادھو بھیا تو کیا ہوا مالا پہنی چار — باہر بھیس بنا لیا بھیتر بھرا انگار

گلے میں چار مالا ڈال کر اور اوپر سے گیروا لباس پہن کر سادھو بن گئے لیکن دل میں خیانت بھری ہوتی [illegible] ایسے بگلا بھگت سادھوؤں سے بچو۔

(۲۸)

کیس مونڈاتے کیا ہوا مونڈا سو سو بار
من کو کیوں نہیں مونڈتے جامن بسے وکار

سر منڈا کر پنڈت مہاتما بننے سے کیا فائدہ ہوا۔ اپنے دل کو صاف کیوں نہیں کرتے جس میں ہر طرح کی

خرابی بھری ہوتی ہے۔

(۲۹)

تن کو جوگی سب کریں جن کو کرے نہ کوئے
جیسے سب سدھی پاتے جو من جوگی ہوئے

تن کا جوگ سب کو پسند ہے۔ دل کو کوئی جوگی نہیں بناتا یعنی دل کی آرائش کوئی نہیں کرتا۔

(۳۰)

نہاتے دھوتے کیا بھیا جو من کا میل نہ جائے
مین سدا جل میں رہے دھوتے باس نہ جائے

اگر دل کا میل تو نے نہیں دھویا تو نہانے دھونے سے کیا فائدہ۔ مچھلی ہمیشہ پانی میں رہتی ہے پھر بھی اس کی بدبو دور نہیں ہوتی۔

(۳۱)

جیون تل ماہیں تیل ہے جیوں چقمک میں آگ
تیرا پریتم تجھ میں جاگ سکے تو جاگ

جس طرح تل میں تیل ہوتا ہے اور چقماق میں آگ اسی طرح تیرا پیارا تیرے دل کے اندر ہے ہوشیار ہونا ہے تو ہوشیار ہو جا۔

(۳۲)

سمرن سرت لگائے کے مکھ تے کچھ نہ بول
باہر کے پٹ موند کے انتر کے پٹ کھول

خدا کو دل ہی دل میں یاد کر اور زبان سے کچھ نہ کہہ۔ باہر کا کواڑ بند کر دے اور اندر کا کواڑ کھول دے یعنی چشم دل کو وا کرے۔

(۳۳)

جب ہی نام ہردے دھرو بھیو پاپ کو ناس
جیسے چنگی آگ کی پڑی پرانی گھاس

جب تو خدا کا نام صدق دل سے لیگا تو اسم باری سے تیرے گناہ دُھل جائیں گے۔ جیسے آگ کی ذرا سی چنگاری پرانی گھاس کو جلا دیتی ہے۔

(۳۴)

کبیر کھڑی سرائے بھلا جا بکے نکے نام — جا مکھ نام نہ نکلے سو مکھ ہے کس کام

اے کبیر مونھ وہی اچھا ہے جس سے خدا کا نام نکلے۔ جس مونھ سے خدا کی تعریف بیان نہ ہو وہ بھلا کس کام کا ہے۔

(۳۵)

مالا تو کر میں پھرے جیبھ پھرے مکھ ماہنہ
منوا تو چہوں دس پھرے یہ تو سمرن ناہنہ

تسبیح تو ہاتھ میں پھر رہی ہے اور زبان مونھ کے اندر چلتی ہے۔ دل چاروں طرف بھٹکتا پھرتا ہے یہ تو کوئی عبادت نہیں ہوئی۔

(۳۶)

مالا پھیرت جگ موا گیا نہ من کا پھیر
کر کا من کا ڈال دے من کا من کا پھیر

تسبیح ہلاتے ہلاتے دنیا تباہ ہوئی لیکن دل کا میل پھر بھی دور نہیں ہوا۔ ہاتھ کی تسبیح پھینک دے اور دل کی تسبیح پھیر۔

(۳۷)

سمجھے تو گھر میں رہے پردا پلک لگائے
تیرا صاحب تجھ میں امانت کہوں مت جائے

اگر تو عقلمند ہے تو گھر میں پلکوں کا پردا لگا کر بیٹھ جا۔ تیرا خدا تیرے دل میں موجود ہے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں۔

(۳۸)

جیوں تینن میں پرتری تیوں خالق گھٹ ماتھ
مورکھ لوگ نہ جانہیں باہر ڈھونڈھن جاتھ

جیسے آنکھوں میں پتلی ہے اسی طرح دل میں خدا ہے۔ ناداں اس بھید سے ناواقف ہیں اور وہ خدا کو باہر تلاش کرنے جاتے ہیں۔

(۳۹)

رام نام کڑوا لگے میٹھے لاگے دام — دبدھا میں دونوں گئے مایا ملی نہ رام

رام کا نام کڑوا لگتا ہے اور روپیہ پیسہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اسی ادھیڑ بن میں کہ عبادت کریں یا روپیہ جمع کریں نہ مال ہی ملا نہ خدا۔ اک شاعر نے اسی کو یوں کہا ہے

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم — نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

(۴۰)

ھردے ماھیں آرسی مکھ دیکھا نہیں جائے
مکھ تو تب ہی دیکھئے جب دل کی دبدھا جائے

دل ہی کے اندر آرسی ہے لیکن اس میں چہرہ دکھائی نہیں دیتا۔ چہرہ تو اسی وقت دکھائی دے گا جب دل کا میل دور ہو جائے۔

۱۹۸۲ء میں جدا ہو گئے ہم سے یہ لوگ

شمیم متھراوی

(۲۱)

نجم الحسن کرارودی حاجیٔ باغِ ارم

۱۹۸۲ء

تحریکِ پاکستان کے سرگرم و نامی کارکن — رخصت ہوئے جب ناگہاں نجم الحسن کراروی
اُن کی شمیمؔ زار کو تاریخِ رحلت یوں ملی — "نازِ گلستانِ جناں نجم الحسن کرارودی"

۱۴۰۲ھ

(ممتاز عالمِ دین تحریکِ پاکستان کے سرگرم کارکن اور اسلامی نظریاتی کانسل کے سابق رکن مولانا سید نجم الحسن کراروی نے یکم جولائی ۱۹۸۲ء مطابق ۹ رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ بروز پنج شنبہ بعمر ۷۶ سال پشاور میں رحلت ... تدفین ۲ جولائی کو عمل میں آئی)

(۲۲)

"کامل القادری مایلِ ریاضِ جنت"

۱۹۸۲ء

وہ محقق ادیب اور شاعر اُٹھا — جس کی تحقیق پر مُلک نے داد دی
اے شمیمؔ اُن کی تاریخِ رحلت ملی — "گوشۂ خُلد میں کامل القادری"

۱۴۰۲ھ

(ممتاز ادیب، شاعر اور محقق سید محمد کامل القادری نے ۲ جولائی ۱۹۸۲ء مطابق ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ ... ۲ بجے شب کراچی میں انتقال فرمایا۔ تدفین لب میوہ شاہ قبرستان میں ہوئی)۔

(۲۳)

"رکنِ عالم صدیقی سیرِ باغِ جناں"

۱۹۸۲ء

خُلد کے پاسبان اور کچھ اب نہ کہہ — تیری باتوں کا مفہوم ہم پا گئے
تو بھی چاہتا ہے بتانا یہیں — "رکنِ عالم بہشتِ ارم پا گئے"

۱۴۰۲ھ

(سابق ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر اور ممتاز ادیب جناب رکن عالم صدیقی نے ۴ جولائی ۱۹۸۲ء مطابق ۱۲ رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ بروز یک شنبہ کراچی میں رحلت کی۔ عمر تقریباً ۶۵ سال پائی)۔

(۲۴)

"اُف رخصت قابل گلاؤٹھوی"

۱۹۸۲ء

شاعرِ معروف پاک و ہند کے — محفلِ فردوس میں داخل ہوئے
اُن کی تاریخِ اجل نکلی شمیمؔ — "ساکنِ باغِ عدم قابل ہوئے"

۱۴۰۲ھ

(برصغیر پاک و ہند کے بزرگ صحافی اور معروف شاعر علامہ سید قابل گلاؤٹھوی نے ۵ جولائی ۱۹۸۲ء مطابق ۱۳ رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ بروز دو شنبہ "داہ" میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم کی تدفین اسی شام واہ کینٹ کے قبرستان میں عمل میں آئی)۔

(۲۵)

"ہائے رحلتِ خدیجہ مستور"

۱۹۸۲ء

اے ناول و افسانہ کو روتا تم اب — ہو گئی ہیں جدا تم سے ادیبہ مشہور
جب ڈھونڈ رہا تھا سنِ رحلت تو شمیمؔ — ہاتف نے کہا "جا بسیں خدیجہ مستور"

۱۴۰۲ھ

[مش]ہور افسانہ نگار اور ناول نگار خاتون محترمہ خدیجہ مستور نے ۲۶ جولائی ۱۹۸۲ء مطابق ۵ شوال المکرم ۱۴۰۲ھ بروز [...]شنبہ بعمر ۵۵ سال لندن میں رحلت کی۔ مرحومہ کی میت لاہور لائی گئی اور ۲۹ جولائی ۱۹۸۲ء کو تدفین گل برگ قبرستان [...]میں عمل میں آئی)۔

---

(۲۶)

"رئیس فروغ بادشۂ جناں"

۱۹۸۲ء

چل بسے محترم رئیس فروغ — آہ اجل تسلیم رئیس فروغ
سال رحلت ہے اُن کا منقوط — بادشاہ ارم رئیس فروغ

۱۴۰۲ھ (منقوط)

(ممتاز شاعر اور ادیب جناب رئیس فروغ نے ۵ اگست ۱۹۸۲ء مطابق ۱۵ شوال المکرم ۱۴۰۲ھ بروز [...]شنبہ کراچی میں رحلت فرمائی۔ مرحوم کو شام تک کمپری ہنسوبائی اسکول کے پیچھے واقع قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا)

---

(۲۷)

"تاریخ اجل احمد شمیم مرحوم"

۱۹۸۲ء

احمد شمیم گلشن جنت میں جا بسے — الطاف اب ہم انہیں اللہ میاں کے ہیں
یوں خلد سے شمیم ندا دی سروش نے — احمد شمیم وارث دو الی جناں کے ہیں

۱۴۰۲ھ

(ممتاز ادیب و شاعر جناب احمد شمیم نے ۷ اگست ۱۹۸۲ء مطابق ۱۷ شوال المکرم ۱۴۰۲ھ بروز [...]نہ بعمر ۵۳ سال راولپنڈی میں انتقال فرمایا۔ عصر کی نماز کے بعد مرحوم کا جسد خاکی عید گاہ قبرستان راولپنڈی میں [سپ]رد لحد کیا گیا)

---

(۲۸)

"شور رحلت اقبال احمد خان"

۱۹۸۲ء

ایک اخباری سبھا میں صدر پاکستان سے — وہ مخاطب تھے جب اُن کا رک گیا ساز حیات
یوں کہی تاریخ رحلت اُن کی ہاتف نے شمیم — "پا گئے اقبال احمد خاں بھی واے وفات"

۱۴۰۲ھ

(معروف صحافی جناب اقبال احمد خان نے ۸ اگست ۱۹۸۲ء مطابق ۱۸ شوال المکرم ۱۴۰۲ھ بروز یک شنبہ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کراچی میں صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی پریس کانفرنس کے دوران ایک سوال پوچھتے ہوئے رحلت کی۔ مرحوم کو رات گئے پی ای سی ایچ ایس کراچی کے قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا)

---

(۲۹)

"سکون آ گیں مزار جناب تسلیم فاضلی"

۱۹۸۲ء

آج تسلیم فاضلی کا شمیم — حرکت قلب ہو گئی معدوم
اُن کی تاریخ غم ہے منقوط — قلب تسلیم فاضلی مرحوم

۱۴۰۲ھ (منقوط)

(ممتاز شاعر اور فلمی نغمہ نگار جناب تسلیم فاضلی نے ۱۷ اگست ۱۹۸۲ء مطابق ۲۷ شوال المکرم ۱۴۰۲ھ بروز سہ شنبہ بعمر ۲۸ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کا جسد خاکی رات تک سخی حسن کے قبرستان میں سپرد لحد کردیا گیا)

---

(۳۰)

"آہ آہ سانحہ قتل ظہور الحسن بھوپالی"

۱۹۸۲ء

گولی لگنے سے وہ شہید ہوئے — اور جنت کے ہو گئے والی
ان کے مرقد پہ اے شمیم لکھو — "ذابح گاہ ظہور بھوپالی"

۱۴۰۲ھ

(استحکام پاکستان کونسل کے بانی، وفاقی مجلس شوریٰ کے رکن اور نوجوان محب وطن رہنما جناب ظہور الحسن بھوپالی کو ۱… ستمبر ۱۹۸۲ء مطابق ۲۴ ذیقعدہ ۱۴۰۲ھ بروز دوشنبہ بعمر ۳۶ سال چند حملہ آوروں نے سٹین گنوں سے شہید کر دیا مرحوم کو …رات تک حبیب لائن میں بنیادی مسجد (ایم اے جناح روڈ) کے قریب سپردِ خاک کیا گیا۔)

---

(۳۱)

"جبرئیل صدیقی گلِ خانۂ بہشت میں"

۱۹۸۲ء

کار کے اُلٹ حادثے میں جاں دے کر — جبرئیل صدیقی خلد کے ہوئے راہی
اور ہاتفِ غیبی یوں شمیم سے بولا — "ہیں بہشت کے ساکن جبرئیل صدیقی"

۱۴۰۲ھ

(ممتاز شاعر، ایڈووکیٹ اور حیدرآباد کے رکن مجلس شوریٰ جناب جبرئیل صدیقی سکرنڈ سے دو میل کے فاصلے پر …ٹریفک کے حادثے میں ۱۴ ستمبر ۱۹۸۲ء مطابق ۲۵ ذیقعدہ ۱۴۰۲ھ بروز سہ شنبہ جاں بحق ہو گئے۔ مرحوم کا جسدِ خاکی حیدرآباد …لایا گیا اور رات تک کنٹونمنٹ کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی)

---

(۳۲)

آہ آہ قضائے نواب مظفر علی قزلباش"

۱۹۸۲ء

قزلباش صاحب کی رحلت پر — خدا کی طرف سے مدد مل گئی
نکالی اُن کی تاریخ رحلت شمیم — "مظفر علی کی لحد" مل گئی

۱۴۰۲ھ

(پاکستان کے سابق وزیر خزانہ اور سفیر نواب مظفر علی قزلباش نے ۲۱ ستمبر ۱۹۸۲ء مطابق ۳ ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ …بروز سہ شنبہ بعمر ۷۴ سال رائل مرشدن اسپتال لندن میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کی نعش پاکستان لائی گئی اور …۲۴ ستمبر کو کربلا گامے شاہ لاہور میں سپردِ خاک کی گئی۔)

---

(۳۳)

"حیف بیگم اختر سلیمان پنجۂ مرگ میں"

۱۹۸۲ء

انتقال فرمایا آہ بیگم اختر نے — چھپ گیا وطن کا اک گوہرِ منوّر لکھ
اے شمیم قرآں سے انتقال کی تاریخ — "ہو گئیں جُدا ہاتے آج بیگم اختر لکھ"

۱۴۰۲ھ

سابق وزیر اعظم پاکستان حسین شہید سہروردی کی صاحبزادی اور ملک کی نامور خاتون، سماجی رہنما بیگم اختر سلیمان یکم اکتوبر ۱۹۸۲ء مطابق ۱۳ ذی الحج ۱۴۰۲ھ بروز جمعہ بعمر ۶۰ سال خالق حقیقی سے جا ملیں۔ ۲ اکتوبر کو مرحومہ کا جسدِ خاکی گلشن اقبال کراچی کے قبرستان میں اُن کے شوہر شاہ احمد سلیمان مرحوم کی لحد کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا۔)

---

(۳۴)

"ارتحالِ عزیز احمد وزیر خارجۂ سابق"

۱۹۸۲ء

ہو گیا سابق وزیر خارجہ کا انتقال — اس خبر سے غم زدہ اہلِ وطن بے حد ہوئے
مصرعِ تاریخِ رحلت یوں ملا اُن کا شمیم — "صاحب باغِ عدم ہاتے عزیز احمد ہوئے"

۱۴۰۳ھ

(پاکستان کے سابق وزیر خارجہ جناب عزیز احمد نے ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۲ء مطابق ۵ محرم الحرام ۱۴۰۳ھ بروز شنبہ بعمر ۶… سال واشنگٹن (امریکہ) کے ایک اسپتال میں انتقال فرمایا۔ میت کراچی لائی گئی اور ۲۸ اکتوبر ۱۹۸۲ء جمعرات کو ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کے قبرستان میں سپردِ لحد کی گئی۔)

---

(۳۵)

"غلام عباس کا سوگ افزا انتقال"

۱۹۸۲ء

ہوا اک بڑا افسانہ نگار رخصت — مرے مخاطب یہی خبر آج کی ہے تازہ

شمیمؔ ہاتف نے ان کی تاریخِ غم کی خاطر ۔۔۔ کہا "گیا اُف غلام عباس کا جنازہ"

۱۴۰۳ھ

(برصغیر کے مشہور افسانہ نگار غلام عباس نے ۲ نومبر ۱۹۸۲ء مطابق ۱۵ محرم الحرام ۱۴۰۳ھ (پیر اور منگل کی درمیانی شب میں ۱۲ بجے) بعمر ۷۳ سال کراچی میں رحلت کی۔ تیسرے پہر مرحوم کو پی ای سی ایچ ایس کے قبرستان میں سپردِ لحد کیا گیا۔)

---

(۳۶)

"شباب کیرانوی داخلِ مکانِ خُلد"

۱۹۸۲ء

وہ اب تمہاری صدا کا کوئی جواب دینے نہ آسکیں گے ۔۔۔ شباب کیرانوی امینِ بہارِ فردوس ہو گئے ہیں

شمیمؔ تاریخِ مرگ ان کی سروشِ غیبی نے یوں عطا کی ۔۔۔ "شباب کیرانوی مکینِ دیارِ فردوس ہو گئے ہیں"

۱۴۰۳ھ

(ممتاز فلم ساز و ہدایت کار، معروف شاعر و مصنف شباب کیرانوی نے ۵ نومبر ۱۹۸۲ء مطابق ۱۸ محرم الحرام ۱۴۰۳ھ بروز جمعہ کراچی میں انتقال فرمایا۔ ہفتے کے دن مرحوم کو ان کی وصیت کے مطابق شباب اسٹوڈیو میں اُن کی والدہ ماجدہ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔)

---

(۳۷)

"ڈاکٹر مس سارہ صدیقی مالکِ گوشۂ فردوس"

۱۹۸۲ء

ڈاکٹر مس سارہ صدیقی سے حوروں نے کہا ۔۔۔ حاضرِ خدمت ہیں ہم جو حکم بھی فرمائیں آپ

یوں شمیمؔ آواز دی رضواں نے لو تاریخ بھی ۔۔۔ "سارہ صدیقی مکانِ خُلد میں آجائیں آپ"

۱۴۰۳ھ

(برصغیر کی پہلی خاتون ڈاکٹر اور ڈو میڈیکل کالج کی پہلی خاتون پروفیسر اور خدیجۃ الکبریٰ انعام یافتہ ڈاکٹر مس سارہ عبدالقادر صدیقی نے ۱۰ نومبر ۱۹۸۲ء مطابق ۲۳ محرم الحرام ۱۴۰۳ھ بروز چہار شنبہ بعمر ۷۶ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ مرحومہ کو اسی شام میوہ شاہ کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔)

(۳۸)

"رازؔ مرادآبادی داخلِ ریاضِ جنّت"

۱۹۸۲ء

رازؔ اِک شاعرِ مشہور کی رحلت سے شمیمؔ ۔۔۔ محفلِ شعر و ادب ہو گئی سُونی سُونی

اُن کی تاریخِ اجل کے لیے رضواں بولا ۔۔۔ "مجلسِ خُلد میں ہیں رازؔ مرادآبادی"

۱۴۰۳ھ

(ممتاز شاعر اور براڈ کاسٹر جناب ساجد علی خاں رازؔ مرادآبادی نے ۲۲ نومبر ۱۹۸۲ء مطابق ۵ صفر المظفر ۱۴۰۳ھ بروز دوشنبہ بعمر ۶۶ سال "واہ" (نزد راولپنڈی) میں رحلت کی۔ مرحوم کی میت کراچی لائی گئی اور ۲۴ نومبر کو پاپوش نگر کے قبرستان میں سپردِ لحد کی گئی۔)

---

(۳۹)

"ملکۂ موسیقی روشن آرا بیگم کی ظلال آسا رحلت"

۱۹۸۲ء

وہ شمعِ آواز و سازِ جشنِ دوام ۔۔۔ بجھی تو ہاتف نے یوں پکارا

شمیمؔ تاریخِ مرگ لکھ دے ۔۔۔ "ملالِ تدفینِ روشنی آرا"

۱۴۰۳ھ

(برصغیر کی مشہور کلاسیکی گلوکارہ روشن آرا بیگم (وحیدالنساء بیگم) نے ۵ دسمبر ۱۹۸۲ء مطابق ۱۸ صفر المظفر ۱۴۰۳ھ بروز یک شنبہ بعمر ۶۲ سال لالہ موسیٰ میں انتقال فرمایا۔ ۶ دسمبر کو مرحومہ کی تدفین لالہ موسیٰ ہی میں عمل میں آئی۔)

---

(۴۰)

"شیخ عنایت اللہ مالکِ کوچۂ فردوس"

۱۹۸۲ء

قرآن کی اشاعت کے صلے میں آپ اب — جنت میں کریں راج عنایت اللہ
حوروں نے شمیمؔ ان کو سنایا مژدہ — "ہیں خلد میں آپ آج عنایت اللہ"

۱۴۰۳ھ

(اشاعت قرآن کے سب سے بڑے اور قدیم ادارے تاج کمپنی لمیٹیڈ کے بانی شیخ عنایت اللہ نے ۱۶؍ دسمبر ۱۹۸۲ء مطابق [illegible] المظفر ۱۴۰۳ھ بروز پنج شنبہ بعمر ۸۰ سال ۱۱½ بجے شب کراچی میں رحلت کی۔ ۱۷ دسمبر کو بعد نماز جمعہ مرحوم کا جسد خاکی [illegible] کے احاطہ میں سپرد لحد کیا گیا۔)

---

(۴۱)

"نواب انور حسین تاجدارِ فردوس

۱۹۸۲ء

انور حسین بزم صحافت کو چھوڑ کر — جب کوچۂ یار جناں کے مکیں ہوئے
داروغۂ ریاض جناں نے کہا شمیمؔ — "انور حسین صاحب خلد بریں ہوئے"

۱۴۰۳ھ

(ممتاز صحافی اور روزنامہ ڈان کراچی کے اسپورٹس رپورٹر نواب انور حسین (انوجاتی) نے ۱۸؍ دسمبر ۱۹۸۲ء مطابق یکم ربیع الاول ۱۴۰۳ھ بروز ہفتہ بعمر ۶۴ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔)

---

(۴۲)

حفیظ جالندھری داعیِ خُلد"

۱۹۸۲ء

شعر و سخن کا تاج ور — ملک عدم میں ہے حفیظ
بولا شمیمؔ سے سروش — "بزم ارم میں ہے حفیظ"

۱۴۰۳ھ

(قومی ترانے کے خالق اور پاک و ہند کے ممتاز اردو شاعر جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری نے ۲۱؍ دسمبر ۱۹۸۲ء مطابق [illegible] ربیع الاول ۱۴۰۳ھ بروز سہ شنبہ بعمر ۸۲ سال لاہور میں فرشتۂ اجل کا استقبال کیا۔ بروز چہار شنبہ ماڈل ٹاؤن لاہور کے قبرستان میں مرحوم کو امانتاً سپرد خاک کیا گیا۔)

رفتارِ ادب

کتاب کا نام : دبدن
مصنف : طاہر آفریدی
ملنے کا پتہ : ۹۴/اے۔ بلاک ۳۔ گلشن اقبال کراچی
قیمت : تیس روپے

طاہر آفریدی پشتو زبان میں افسانے لکھتے ہیں اور ان کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ زیر تبصرہ افسانوں کا مجموعہ "دبدن" ان کے اردو افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں انیس افسانے شامل ہیں جو ایک مخصوص رنگ و بیان کے حامل ہیں۔ ماحول کی ترجمانی طاہر صاحب کے قلم سے واضح ہوتی ہے۔ ان کی افسانوں میں طہارت اور ماحول میں آفریدی حق البتہ ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں حقیقت نگاری سے کام لیا ہے اور بشریت کے بھلے برے نقوش اجاگر کرنے کی حق الوسع کوشش کی ہے۔ وہ افسانے کے کسی مخصوص دبستان فکر کے پابند نہیں بلکہ وہ اپنا خود ایک دبستان بنانے کی راہ پر گامزن نظر آتے ہیں۔

کتاب کی طباعت اور گیٹ اپ دیدہ زیب ہے۔

(ادارہ)

کتاب کا نام : آزادیٔ نسواں کا نیا سویرا
مصنف : ثاقب رزمی
ناشر : مکتبہ دانیال۔ ۲۰ وکٹوریہ چیمبر سر عبداللہ ہارون روڈ کراچی
سن طباعت : ۱۹۸۲ء
قیمت : پچیس روپے

"آزادیٔ نسواں کا نیا سویرا" پیش نظر ہے۔ یہ ایک طویل تمثیلی رزمیہ نظم ہے جس میں [illegible] مصنف نے مختلف ادوار میں عورتوں کی جدوجہد آزادی کی داستان کے مختلف مراحل کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا اور عورت کی حمایت

[...]دگی کے ارتقاء کو تاریخی، معاشرتی اور ثقافتی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ انداز بیان عام فہم ہے جس کے باعث اسے ایک قابل قدر کوشش [...] جا سکتا ہے۔

اس کتاب میں اٹھارہ باب یا مناظر ہیں جن میں موضوع کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ اس جدوجہد آزادی کی نمایاں [...]ات کا مختصر تذکرہ بھی شامل کتاب ہے جسنے اس کو تاریخی سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

ادب نسواں پر کتابیں تو ملتی تھیں لیکن یہ پہلو ابھی تک تشنۂ بیان تھا۔ اس کمی کو فاضل مصنفہ نے بڑے احسن طریق پر پورا [...]ہے۔ اور اس نوعیت سے یہ اولیں کوشش سمجھی جائیگی تعلیم یافتہ مستورات اور کالجوں کی طالبات کے لیے ایک اچھا تحفہ تھا

کتاب کا گیٹ اپ اور کتابت اچھی ہے۔ سرورق میں بھی حسن کا تاثر نمونہ پیش کیا گیا ہے عورت کی تصویر میں زنجیر غلامی [...]علامت بندوق جدوجہد کی علامت اور جھنڈا آزادی کا نشان ہے۔ کتاب کی قیمت اس کی افادیت کے اعتبار سے کچھ [...]یادہ نہیں۔

(توقیر صدیقی)

نئے خزانے

ابو سلمان شاہجہاں پوری

یہ اشاریہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔

ادب ۔ مسائل و مباحث
اردو زبان اور اس کے مسائل
تاریخ و سیاست
تحقیق و تنقید
تعلیم اور صحافت
خطوط
خود نوشت
سیر و سیاحت
شخصیات :
مولانا احمد رضا خان
علامہ اقبال
حسن منظر
چودھری غلام عباس
قائد اعظم

ادبی و علمی شخصیات
تاریخی و سیاسی شخصیات
صحابہ کرام رضی
مذہبی شخصیات
طب و سائنس
فنون لطیفہ اور فلسفہ
کتابیات
مذہبیات :
تحریکات، مسالک و مکاتیب
سیرت نبوی
قانون و سیاست اسلامی
قرآن و تفسیر
مسائل و مباحث

اس اشاریے کی ترتیب میں دسمبر ۸۱ء اور دیگر
مہینوں کے مندرجہ ذیل رسائل سے مدد لی گئی ہے

ماہنامہ	اخبار اردو	کراچی	دسمبر	۱۹۸۱ء
"	اظہار	"	"	"
"	افکار	"	"	"
"	برہان	دہلی	"	"
"	البلاغ	کراچی	"	"
"	پاکستان لائبریری بلیٹن	"	جون	"
"	پیام عمل	لاہور	دسمبر	"
"	تخلیق	"	نمبر ۱۱، ۱۲	"
"	ترجمان القرآن	"	دسمبر	"
"	ترجمان اہل سنت	کراچی	"	"
"	الحق	اکوڑہ خٹک	"	"
"	راہنمائے صحت	فیصل آباد	"	"
"	سب رس	کراچی	"	"
"	صدائے اسلام	پشاور	ستمبر	"
"	طلوع اسلام	لاہور	دسمبر	"
"	فاران	کراچی	"	"
"	فکر و نظر	اسلام آباد	"	"
"	فیض الاسلام	راولپنڈی	"	"

ماہنامہ	قومی زبان	کراچی	دسمبر	۱۹۸۱ء
"	محدث	لاہور	"	"
"	المعارف	"	"	"
"	ہمدرد صحت	کراچی	"	"
پندرہ روزہ	تعمیر حیات	لکھنؤ	"	۱۹۸۰ء
"	خبرنامہ	لاہور	"	"
"	صحیفہ اہل حدیث	کراچی	"	"
"	ندائے افغان	ملتان	"	"
ہفت روزہ	الاسلام	لاہور	"	"
"	الاعتصام	"	"	"
"	الہام	بہاولپور	"	"
"	الانصاف	راولپنڈی	"	"
"	چٹان	لاہور	"	"
"	خدام الدین	"	"	"
"	رضاکار	"	"	"
"	الشمس	ملتان	"	"
"	کشمیر	راولپنڈی	"	"
"	لاہور	لاہور	"	"

ادب — مسائل و مباحث

ابو طاہر زارانی	عربوں کی عوامی رزمیہ شاعری	لاہور	لاہور	۲۷ دسمبر ۱۹۸۱ء	ص	۱۱
آفتاب ابڑو	سندھی ادب میں لغت نویسی	اظہار	کراچی	" "	ص	۳۵
بخت روان، ڈاکٹر ابوالفضل	ملت افغان اور عربی زبان و ادب کی خدمات	الحق	اکوڑہ خٹک	" "	ص	۳۹
رحمن ملک	تحریک اردو کے نشیب و فراز	چٹان	لاہور	۱۴ " "	ص	۲۷
صلاح الدین حیدر	وہی انشائیہ کی بات	"	"	۷ " "	ص	۲۹
کلیم اختر	انگریزی کیوں ضروری ہے؟	"	"	" "	ص	۱۹
نسیم امروہوی	ادبیات میں آنکھ کا مقام	الہام	بہاولپور	۱۴ دسمبر "	ص	۴

اردو زبان اور اس کے مسائل

سجاد، شیخ عطاء اللہ	خطبہ صدارت (اردو انجمنوں کی ۱۸ ویں سالانہ کانفرنس)	قومی زبان	کراچی	" "	ص	۸
عبداللہ، ڈاکٹر سید	خطبہ استقبالیہ (اردو انجمنوں کی ۱۸ ویں سالانہ کانفرنس)	"	"	" "	ص	۵
عقیل، ڈاکٹر معین الدین	نسخ یا نستعلیق؟	اخبار اردو	"	" "	ص	۴
محمد تقی، سید	قومی زبان انگریزی کیوں نہیں؟	قومی زبان	"	" "	ص	۲۲

تاریخ و سیاست

ابوالحسن علی ندوی، مولانا	علم کا مقام اور اہل علم کی ذمہ داریاں	تعمیر حیات	لکھنؤ	۱۰ " "	ص	۲
اختر کاشمیری	مجھ سے ملئے: میں ہوں ولی خان	چٹان	لاہور	۲۱ " "	ص	۸
"	" " " شرکت حیات	"	"	۲۸ " "	ص	۱۰
عالم شاہ، حکیم سید	تحریک آزادی کشمیر اور کرنل (۱)	الانصاف	راولپنڈی	یکم " "	ص	۳
"	" " " "	"	"	۸ " "	ص	۵
حسن نظامی، خواجہ	دل کی کہانی دل کی زبانی	لاہور	لاہور	۶ " "	ص	۳
ذاکر حسین فاروقی، ڈاکٹر	محاربہ کربلا کے بعد	پیام عمل	"	" "	ص	۳

…بتی سعیدی	معالم المدینۃ المنورہ	محدث	لاہور	دسمبر	۱۹۸۱ء	ص ۳۸
…اللہ قریشی	مسلمانوں کی حربی ایجادات اور اسلحہ سازی	فکر و نظر	اسلام آباد	〃	〃	ص ۵۱
…ن مرزا	عالمی بساط سیاست اور پاکستان	چٹان	لاہور	۱۴ر 〃	〃	ص ۲۲
…ڈاکٹر معین الدین	دنیائے اسلام: مسائل، افکار اور تحریکات	فکر و نظر	اسلام آباد	〃	〃	ص ۴۲
…ف فاروقی	عہد جزی میں سفارتی تنظیم	ترجمان القرآن	لاہور	〃	〃	ص ۱۱

تحقیق و تنقید

…ں، حافظ محمد	امام مالک کا خط بنام خلیفہ ہارون الرشید (۷)	صحیفۂ اہل حدیث	کراچی	یکم 〃	〃	ص ۱۴
〃 〃	〃 〃 (۹) 〃	〃	〃	۱۴ر 〃	〃	ص ۲۰
…عبدالوہاب	وشوا بھارتی یونی ورسٹی کے فارسی عربی اور اردو مخطوطات	برہان	دہلی	〃	〃	ص ۵۱
…علی سید	اردو عروض کی پہلی پانچ کتابیں	اظہار	کراچی	〃	〃	ص ۳۲

تعلیم اور صحافت

…ڈاکٹر الف د	انٹرمیڈیٹ کی نصابی اسکیم	اخبار اردو	〃	〃	〃	ص ۷
…و رشید ندوی	عالمی صحافت، اسلام اور مسلمان	تعمیر حیات	لکھنؤ	۲۵ر 〃	〃	ص ۷

خطوط

…آبادی	مکاتیب (بنام میرزا سلطان احمد)	لاہور	لاہور	۱۳ر 〃	〃	ص ۲۷
…اللہ ثبات	مکتوب بنام ثاقب زیروی	〃	〃	〃 〃	〃	ص ۱

خود نوشت

…محمد سبزواری	بھوپال کی ممتاز شخصیتیں اور یادگار محفلیں	افکار	کراچی	〃	〃	ص ۱۶

اعجاز فطی	یہ رنگ بھری دنیا	تخلیق	لاہور	نمبر ۱۱، ۱۲	۱۹۸۱ء	ص ۶۳

سیر و سیاحت

سعید احمد اکبر آبادی، مولانا	پاکستان، جنوبی افریقہ اور پھر پاکستان	برہان	دہلی	دسمبر	〃	ص ۳۸

شخصیات

مولانا احمد رضا خان

رشید محمود، راجہ	اعلیٰ حضرت کا مسلک	ترجمان اہل سنت	کراچی	〃	〃	ص ۳۴
عبدالکریم، مولانا	ایشیا کا عظیم محقق	〃	〃	〃	〃	ص ۱۱
…از محمد گیلانی، سید	مولانا امام احمد رضا خان کی خدمات	〃	〃	〃	〃	ص ۴۶

علامہ اقبال

تارا چرن رستوگی، ڈاکٹر	مولانا ابوالحسن علی ندوی اور افہام اقبال	تعمیر حیات	لکھنؤ	۲۵ر 〃	〃	ص ۹
دارا، پروفیسر طفیل	اقبال اور حیدرآباد دکن کی ملازمت کا مسئلہ	المعارف	لاہور	〃	〃	ص ۳۱
عاطر، محمد طیب	علامہ اقبال اور اسلامی ادارہ	چٹان	〃	۹ نومبر	〃	ص ۳۵
محمد علی صدیقی	روایت — اقبال اور شریعتی	افکار	کراچی	دسمبر	〃	ص ۱۲
وزیر آغا، ڈاکٹر	اقبال کا نظریۂ ثقافت	تخلیق	لاہور	نمبر ۱۱، ۱۲	〃	ص ۷

حسن منظر

حسن منظر	تخلیق ادب اور معاشرہ	افکار	کراچی	دسمبر	〃	ص ۲۸
خالد وہاب	حسن منظر کی افسانہ نگاری	〃	〃	〃	〃	ص ۳۴
صہبا لکھنوی	حسن منظر — مختصر حالات	〃	〃	〃	〃	ص ۲۷
عباس، مرزا عابد	حسن منظر کے افسانے	〃	〃	〃	〃	ص ۳۰

چودھری غلام عباس

…جیب	چودھری غلام عباس	کشمیر	راولپنڈی	۱۵ر دسمبر	۸۱ء	ص	۴
…بدالقیوم، سردار محمد	" " "	"	"	"	"	ص	۹
…زم داد چودھری	" " "	"	"	"	"	ص	۶

قائد اعظم

…طاف مجاہد	محمد علی جناح سے قائد اعظم تک	افق	کراچی	۲۶ر	"	ص	۶
…الد، کریم بخش	قائد اعظم لاڑکانے میں	اظہار	"	"	"	ص	"
…شید محمود، راجہ	بانی پاکستان	"	"	"	"	ص	۵
…ہاب دہلوی، سید	قائد اعظم کی شخصیت کا سحر	الہام	بہاولپور	۲۸ر	"	ص	۲
…لام حیدر، ڈاکٹر	قائد اعظم سندھی شاعروں کے آئینے میں	اظہار	کراچی	"	"	ص	۱۹
…ی جان، محمد	قائد اعظم اور یار شاہ خاں	چٹان	لاہور	۷ر نومبر	"	ص	۱۷

ادبی و علمی شخصیات

…مد میاں، قاضی	مرزا غالب اور امیر مینائی	ناران	کراچی	دسمبر	"	ص	۱۸
…یس شاہ جیلانی، سید	ممتاز حسن - اپنی ذات سے اک انجمن	قومی زبان	"	"	"	ص	۲۸
…زاد، جگن ناتھ	جاں نثار اختر	سب رس	"	"	"	ص	۲۲
…یدار بخت	سلام مچھلی شہری	"	"	"	"	ص	۵۰
…الد، کریم بخش	شاہ عبداللطیف بھٹائی	اظہار	"	"	"	ص	۲۴
…اشد علی، اسدی	دبستان لکھنؤ کا عظیم المرتبت شاعر — آتش	قومی زبان	"	"	"	ص	۳۷
…شفا، حکیم محمد حسین خان	حالی اور رام پور	ناران	"	"	"	ص	۳۴
…مد فراز	مذہب اور عقیدے کی اہمیت اور ممتاز شیریں	تخلیق	لاہور	بز ۱۱، ۱۲	"	ص	۱۴

وحید قریشی، ڈاکٹر	شہاب کا کلام	الہام	بہاولپور	۲۸ر نومبر	۱۹۸۱ء	ص	۵
وحید الدین خاں لودی، محمد	اردو کا پہلا سائنسی غزل گو شاعر (ولی ہاشمی)	سب رس	کراچی	دسمبر	"	ص	۲۹

تاریخی و سیاسی شخصیات

اکرم خان، محمد	سردار رحمت اللہ	کشمیر	راولپنڈی	۸ر	"	ص	۷
انعام الحق	قدرت اللہ شہاب	"	"	۲۲ر	"	ص	۴
آزاد، محمد حسین	چودھری چراغ دین	"	"	۸ر	"	ص	۷
راحت نسیم سوہدروی، حکیم	امام البصریات ابن الہیثم	خبرنامہ طب	لاہور	"	"	ص	۱۴
محمد یعقوب خاں	حاجی ترنگ زئی	ندائے افغان	ملتان	۱۶ر	"	ص	۴
مسکین حجازی	مولانا ظفر علی خاں	چٹان	لاہور	۷ر	"	ص	۲۱

صحابہ کرامؓ

طالب ہاشمی	حضرت فرالافرع تمیمی	ناران	کراچی	"	"	ص	۴
" "	دو پروانے شمع رسالت کے	محدث	لاہور	"	"	ص	۳۳
علیہ اویس، پروفیسر	حضرت زینب کی شان خطابت	رضاکار	"	۸ر	"	ص	۶
محمد نافع، مولانا	حضرت ابوسفیانؓ	البلاغ	کراچی	"	"	ص	۱۹
نذیر حسین نقوی، مولانا سید	حضرت زینبؓ	رضاکار	لاہور	"	"	ص	۵

مذہبی شخصیات

اخلاق حسین قاسمی، مولانا	تحریر جنتا کید کا ترجمہ اور شاہ عبدالقادر	الحق	اکوڑہ خٹک	"	"	ص	۴۱
اطہر مبارک پوری، قاضی	امام ابوالحسن مدائنی	صدائے اسلام	پشاور	ستمبر	"	ص	۹
اکبر شاہ بخاری، مولانا	مولانا محمد شریفؒ	البلاغ	کراچی	دسمبر	"	ص	۵۲
انور طاہر	مولانا عبدالقادر حصاریؒ	الاعتصام	لاہور	۴ر	"	ص	۹
ایوب قادری، ڈاکٹر محمد	برصغیر میں سہروردی سلسلۂ تصوف کا آغاز و ارتقا	ترجمان اہل سنت	کراچی	"	"	ص	۳۶

...ی توحیدی	مولانا عبدالعزیز میمنی	الاسلام	لاہور	۱۸ر دسمبر	۱۹۸۱ء	ص ۷
...ن الدین سنبھلی، مولانا	مولانا سید فخرالدین احمد (۲)	صدائے اسلام	پشاور	ستمبر	〃	ص ۱۴
...ن جعفری، سرفراز حسین	علامہ قاضی سید نور راشد شوشتری	رضاکار	لاہور	۲۴ر نومبر	〃	ص ۳
...ظ رضا پسروری	قافلہ احرار کا سپاہی — قاضی احسان احمد شجاع آبادی	چٹان	〃	۷ر دسمبر	〃	ص ۲۲
...ت، پروفیسر محی الدین	داتا گنج بخش رح	الہام	بہاولپور	۲۹ر 〃	〃	ص ۲
...ن احمد حامدی	کمال سنانیری شہید	ترجمان القرآن	لاہور	〃	〃	ص ۲۵
...حت علی قادری، سید	حضرت زین العابدین	ترجمان اہل سنت	کراچی	〃	〃	ص ۸
...ر آفاقی، پروفیسر ڈاکٹر	ملا طاہر غنی	فیض الاسلام	راولپنڈی	〃	〃	ص ۱۷
...ر شید عراقی	تذکرہ علمائے اہل حدیث: مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی	الاسلام	لاہور	۴ر 〃	〃	ص ۹
〃 〃	حافظ ابن عبدالبر قرطبی	فاران	کراچی	〃	〃	ص ۲۳
...الغفور سلیمانی، محمد	حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی	ترجمان اہل سنت	〃	〃	〃	ص ۴۳
...صدیق ہزاروی	مولانا شاہ مصطفیٰ رضا خان	الہام	بہاولپور	۱۴ر 〃	〃	ص ۵
...راشدی	شاہ غلام رسول قادری	المعارف	لاہور	〃	〃	ص ۴۵

طب و سائنس

...، ڈاکٹر محمد شعیب	جسم کو تندرست رکھنے والا نظام	ہمدرد صحت	کراچی	〃	〃	ص ۳۲
...ن الٰہی علوی، ڈاکٹر	ہومیو پیتھک طریقۂ علاج	افق	〃	۲۶ر 〃	〃	ص ۱۷
...الاسلام، پروفیسر	پاکستان میں سائنس کا مستقبل	لاہور	لاہور	۱۳ر 〃	〃	ص ۱۳
...سعید، حکیم	مسئلہ غذا	ہمدرد صحت	کراچی	〃	〃	ص ۴
——	آب زم زم	راہنمائے صحت	فیصل آباد	〃	〃	ص ۴
——	طب اسلامی اور طب جدید	〃	〃	〃	〃	ص ۳۳
——	طب چین کی کامیابیاں ...	ہمدرد صحت	کراچی	〃	〃	ص ۲۵

فنون لطیفہ اور فلسفہ

...شہاب دہلوی	مسلمانوں کا فن تعمیر	الہام	بہاولپور	۲۸ر نومبر	〃	ص ۴

فیض محمد خان	پٹھانی تہذیب	ندائے افغان	ملتان	۱۶ر دسمبر	۱۹۸۱ء	ص
محمد حنیف، ڈاکٹر	مسلمانان عرب کے تعمیری آثار ماہرین کی نظر میں	الحق	اکوڑہ خٹک	〃	〃	ص
محمد سلیم، پروفیسر سید	محفل — انعام خداوندی	ترجمان القرآن	لاہور	〃	〃	ص
واضح رشید ندوی	موجودہ تہذیب اور انسان	تعمیر حیات	لکھنؤ	۱۰ر 〃	〃	ص

کتابیات

ابو سلمان شاہجہانپوری	نئے خزانے (فروری ۸۱ء کے رسائل کا اشاریہ)	قومی زبان	کراچی	〃	〃	ص
نسیم فاطمہ	ڈاکٹر محمود حسین لائبریری — جامعہ کراچی	پاکستان لائبریری بلیٹن	〃	جون	〃	ص

مذہبیات

تحریکات، مسالک، مکاتب

شفیق خان پسروری، مولانا محمد	لقب اہل حدیث (۱)	صحیفہ اہل حدیث	〃	یکم دسمبر	〃	ص
〃 〃	〃 〃 (۲)	〃	〃	۱۶ر 〃	〃	ص
عبیداللہ اسعدی، مولانا محمد	علمائے دیوبند کی فقہی خدمات	البلاغ	〃	〃	〃	ص
نذیر احمد رحمانی	تحریک اہل حدیث — برصغیر پاک و ہند میں	الاسلام	لاہور	۴ر 〃	〃	ص
〃 〃	〃 〃 〃 (۲)	〃	〃	۱۱ر 〃	〃	ص

سیرت نبویؐ

عارف حصاری، مولانا عبدالقادر	سرکار دو عالم کون ہے؟	صحیفہ اہل حدیث	کراچی	۱۶ر 〃	〃	ص

قانون و سیاست اسلامی

شہاب الدین ندوی	خلافت ارض اور علماء کی ذمہ داریاں	برہان	دہلی	دسمبر	〃	ص
متین خطیب، مولانا محمد	اسلامی مملکت میں حکومت الٰہیہ	البلاغ	کراچی	〃	〃	ص
متین ہاشمی، سید محمد	تشریع اسلامی میں قیاس کا مقام	المعارف	لاہور	〃	〃	ص

فیض محمد خاں — پٹھانی تہذیب — ندائے افغان — ملتان — ۱۶ دسمبر — ۱۹۸۱ء — ص

محمد حنیف، ڈاکٹر — مسلمانان عرب کے تعمیری آثار ماہرین کی نظر میں — الحق — اکوڑہ خٹک — " — " — ص

محمد سلیم، پروفیسر سید — مغل — انعام خداوندی — ترجمان القرآن — لاہور — " — " — ص

واضح رشید ندوی — موجودہ تہذیب اور انسان — تعمیر حیات — لکھنؤ — ۱۰ " — " — ص

کتابیات

ابو سلمان شاہجہان پوری — نئے خزانے (فروری ۸۱ء کے رسائل کا اشاریہ) — قومی زبان — کراچی — " — " — ص

نسیم فاطمہ — ڈاکٹر محمود حسین لائبریری — جامعہ کراچی — پاکستان لائبریری بلیٹن — " — جون — " — ص

مذہبیات

تحریکات، مسالک، مکاتب

شفیق خان پسروری، مولانا محمد — لقب اہل حدیث (۱) — صحیفہ اہل حدیث — " — یکم دسمبر — " — ص

" " — " " (۲) — " — " — ۱۶ " — " — ص

عبید اللہ اسعدی، مولانا محمد — علمائے دیوبند کی فقہی خدمات — البلاغ — " — " — " — ص

نذیر احمد رحمانی — تحریک اہل حدیث — برصغیر پاک و ہند میں — الاسلام — لاہور — ۴ " — " — ص

" " — " " (۲) — " — " — ۱۱ " — " — ص

سیرت نبوی ؐ

عارف حصاری، مولانا عبد القادر — سرکار دو عالم کون ہے؟ — صحیفہ اہل حدیث — کراچی — ۱۶ " — " — ص

قانون و سیاست اسلامی

شہاب الدین ندوی — خلافت ارضی اور علماء کی ذمہ داریاں — برہان — دہلی — دسمبر — " — ص

متین خطیب، مولانا محمد — اسلامی مملکت میں حکومت الٰہیہ — البلاغ — کراچی — " — " — ص

متین ہاشمی، سید محمد — تشریع اسلامی میں قیاس کا مقام — المعارف — لاہور — " — " — ص

قرآن و تفسیر

سعید احمد اکبر آبادی، مولانا — الصابئون (۲) — فکر و نظر — اسلام آباد — دسمبر — ۸۱ء — ص ۸

ظفر ندوی، مولانا محمد فضل قدیر — تفسیر سورہ الفتح — فیض الاسلام — راولپنڈی — دسمبر — ۸۱ء — ص ۱۰

عبد الرشید عراقی — علم تفسیر اور طبقات مفسرین (۱) — صحیفہ اہل حدیث — کراچی — ۱۶ " — " — ص ۵

" " — نزول قرآن اور اس کی ترتیب — محدث — لاہور — " — " — ص ۱۲

وحید الرحمن شاہ، ڈاکٹر — تفسیر کشاف القرآن از حافظ محمد ادریس طوروی — الحق — اکوڑہ خٹک — " — " — ص ۵۱

مسائل و مباحث

پرویز صاحب — عالمگیر انسانیت کے لیے منشور حیات — طلوع اسلام — لاہور — " — " — ص ۱۰

عرفان حیدر عابدی — کردار سازی اور اسلام — رضاکار — " — ۲۴ نومبر — " — ص ۱

فضل الرحمن — اسلامی معیشت کی بنیادیں (۲) — الاعتصام — " — ۱۱ دسمبر — " — ص ۶

فضل الرحمن، ڈاکٹر — وحدت ادیان کا نظریہ اور اسلام — برہان — دہلی — " — " — ص ۳۰

ماجد علی خان، ڈاکٹر — عدم اسلامیہ اور عقائد کا باہم ربط — المعارف — لاہور — " — " — ص ۵

محمد یوسف فاروقی — مسئلہ حجاب — علمی جائزہ — البلاغ — کراچی — " — " — ص ۴۹

مصطفیٰ سباعی، ڈاکٹر — اشتراکیت اور اسلام — تعمیر حیات — لکھنؤ — ۲۵ " — " — ص ۶

اپریل

pril, 1969

ماہنامہ
جاں نثار
امرتسر

غالب نمبر

مدیر اعلیٰ اعزازی
میلا رام وفا

مدیر
رام لال بھنڈاری

مدیر (اعزازی)
مہندر باوا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب

فی پرچہ:

پیغامات

اکابرینِ ملک کا اظہارِ عقیدت

مسز اندرا گاندھی وزیرِ اعظم ہند۔

مرزا غالب ہمارے ادب کی لافانی شخصیتوں میں سے ہیں۔ وہ ایک بڑے ہی شوخ فکر کی یادگار ہیں۔ ان کے کلام میں زندگی سے محبت اور زندگی کے بہت سے پہلوؤں کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کے وجدان اور ذہنی کرب نے ایک ایسی شاعری کی تخلیق کی ہے، جو برصغیر کے میدانوں میں رہنے والے لوگوں کی زندگی کا حصہ بن گئی ہے۔ ان کے حسین اشعار بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ ایک شاعر کی عظمت کی اس سے بڑھ کر کیا خراجِ عقیدت ہو سکتا ہے۔ کہ اس کے کلام نے ایک دور کے تجربے کو ڈھالنے کا کام کیا ہے۔

سردار گورنام سنگھ وزیرِ اعلیٰ پنجاب۔

سانوں ایہہ سن کے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ تہاڈا رسالہ "جہان نثار" بھی غالب نمبر کڈھ رہا ہے۔

مرزا غالب اک اُچ کوٹی دے شاعر سن۔ اوہناں نے مکمل بھارت وچ سوچاں دے ورثے دیاں لڑیاں نوں اپنے کم دی شاعری پرپت کیتی۔

میں تہاڈے اس اُدم لئی ودھائی دیندا ہاں۔

دستخط: گورنام سنگھ (وزیرِ اعلیٰ پنجاب)

جناب فخر الدین علی احمد وزیرِ صنعتی ترقی بھارت سرکار۔

مجھے یہ معلوم کرکے بے حد مسرت ہوئی کہ ماہنامہ جہان نثار امرت سر ایک غالب نمبر شائع کرنے جا رہا ہے۔ غالب اردو کا محبوب ترین اور مقبول ترین شاعر ہے۔ اس کے علاوہ اردو زبان میں غالب کے خطوط کا درجہ بھی اپنی نظیر آپ ہیں۔ جن میں غالب نے اپنے طرزِ بیان سے ایک لافانی حسن پیدا کر دیا ہے۔ جو ان کے وسیع تر تجربے، مشاہدہ اور اعلیٰ فکر و انتخاب کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ غالب کے قلم کا ہی کمال تھا۔ کہ معمولی معمولی باتوں کو اتنا دلچسپ انداز بیان عطا کیا اور چھوٹی سی بات کو بھی نشان دی۔ بارش کا حال لکھا تو ہماری نظروں میں طوفانی موسم کا ایک نقشہ کھینچ گیا۔ گھر کا حال لکھا تو شکستگی اور تباہی کا ایک منظر سامنے آ گیا۔ حالات میں اضطراب کی بات کی تو ذہن پر نشتر چلا دیا۔ غالب کی تحریر کسی ادبی اصول کی پابند نہیں تھی۔ یہ طبع زاد اور خود ان کی اُپج تھی۔ جو دیکھنے میں آسان لیکن اپنانے میں مشکل۔ پڑھنے میں خوبصورت اور لکھنے میں کٹھن۔ غالب نکتہ رس بھی تھے۔ اور نکتہ سنج بھی۔ نکتہ طراز بھی تھے۔ اور نکتہ آفرین بھی۔ اس وجہ سے غالب جہاں عظیم شاعر تھے۔ وہاں بے نظیر نثار بھی تھے۔

فروری میں مرکزی سنٹینری کمیٹی کی جانب سے غالب کی صد سالہ برسی منانے کے سلسلہ میں تقاریب دہلی میں ہوئیں۔ جن میں بیرونی ممالک سے بھی علماء نے شرکت کی۔ یہ غالب کی عظمت پر ایک قابلِ فخر بات ہے۔ دنیا غالب کی عظمت کی قائل ہو گئی۔ تو اس کی زبان کو بھی بقائے دوام مل سکے گی۔

دستخط: فخر الدین علی احمد

ڈی۔ کے۔ برار، ٹرانسپورٹ منسٹر، پنجاب سرکار

غالب بہت ذہین اور حساس تھے۔ انہی خوبیوں نے انہیں ایک عظیم شاعر بنایا۔ ان کی شاعری میں جو پیغام ملتا ہے، وہ یہ ہے کہ زندگی اپنی کمیوں اور خامیوں کے باوجود خوبصورت اور قابلِ قدر ہے۔

سردار گوردیال سنگھ ڈھلوں ممبر پارلیمنٹ

یہ نہایت مسرت کا مقام ہے کہ ماہنامہ "جہان نثار" ماہ اپریل میں "غالب نمبر" شائع کر رہا ہے۔ غالب ایک عظیم شاعر تھے۔ مگر ایک انسان دوست بھی تھے۔ انہوں نے تنگنائے غزل کو گل و بلبل کے افسانوں کے دائرے سے نکال کر فلسفیانہ افکار کے گل و گلزار سے روشناس کیا۔ اردو زبان کو ایک تاریخ عطا کی۔ اور دنیا کو انسان دوستی، محبت اور صلح و آشتی کا درس دیا۔ حکومتِ ہند نے غالب کی برسی منا کر اپنا حق ادا کیا ہے۔ میری یہ دلی خواہش ہے۔ کہ غالب کے کلام اور ان کے خطوط کو ہندوستان کی دوسری زبانوں میں شائع کرنے کا انتظام کرنا چاہیئے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کے خیالات سے مستفید ہو سکیں۔

(دستخط) گوردیال سنگھ ڈھلوں
(ممبر پارلیمنٹ)

گیانی گورمکھ سنگھ مسافر ممبر پارلیمنٹ

مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی ہے۔ کہ مقبول ماہنامہ "جہان نثار" امرت سر غالب نمبر شائع کر رہا ہے۔ مرزا غالب کا مقام اردو ادب میں بہت بلند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی صد سالہ برسی ہندوستان کے علاوہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی بڑی دھوم دھام سے منائی جا رہی ہے۔ غالب نے اپنی تخلیقات نظم و نثر کے ذریعے اعلیٰ انسانی قدروں کا پرچم بلند کیا۔ انسان دوستی اور رواداری کا سبق دیا۔ ہر چند غالب نے گل و بلبل ہی کے پیرائے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور گل و بلبل، شمع و پروانہ، ساغر و مینا، بادہ و ساغر کی روایتی علامات و اصطلاحات کا استعمال کیا۔ مگر ان کی تخیل کی پرواز بہت بلند تھی۔ انہوں نے ان فرسودہ علامات کو نیا مطلب دیا۔ زندگی کے پیچیدہ مسائل کا حل پیش کیا۔ غالب کا نام اردو کی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

(دستخط) گورمکھ سنگھ مسافر
ممبر پارلیمنٹ

ایم۔ ایل۔ بھاردواج پرنسپل انفارمیشن آفیسر حکومت ہند۔

غالب ہمارا عظیم قومی شاعر ہے۔ اس کی نظم اور نثر دونوں ہی ہمارے عزیز اور مشترکہ قومی ورثے کی اہم یادگاریں ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے۔ کہ غالب کا کلام کئی ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ اس پر فارسی اور اردو ہی کا نہیں۔ بلکہ ہر اس زبان کا حق ہے۔ جس میں غالب کے نغمے گائے اور ادبی اقدار کے زمزمے سنائے جاتے ہیں۔ مرزا کے کلام پر ایک صدی سے زیادہ زمانہ بیت گیا۔ لیکن پھر بھی ہر قوم کو اس میں اپنے ہی دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ غالب کی زندگی بھی اس کے کلام ہی کی طرح تمام رسوم و قیود سے آزاد تھی۔ غالب یکجہتی اور ہم آہنگی کا پیامبر ہے۔ اور اس کے یہاں رواداری و محبت کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔

ہم لوگ جو صحافتی دنیا سے وابستہ ہیں غالب کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتے کہ اس نے اردو نثر کو آسان سلیس اور بول چال کی زبان کے قریب کیا۔ اور اسے روانی، توانائی اور دلفریبی عطا کی۔

میں اس یادگاری موقع پر پوری صحافتی برادری کی طرف سے اور غالب کے عقیدت مندوں اور سخن فہموں کی طرف سے ہدیۂ عقیدت پیش کرتا ہوں۔

* * *

شری بلراج مدھوک ممبر پارلیمنٹ جن سنگھ

مرزا غالب ہمارے دیش کے ایک مہان کوی تھے۔ میں ان کے پرتی اپنی شردھانجلی بھینٹ کرتا ہوں۔

امید نوریلے

مرزا غالب

آبِ حیات کے مصنف شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے اردو شاعری کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور ولی دکنی۔ شاہ مبارک آبرو، شیخ شرف الدین مضمون اور سید محمد شاکر ناجی کا تھا۔ دوسرا شاہ حاتم، خان سراج الدین علی خان آرزو۔ خان اشرف علی خان فغاں، شاہ تسلیم اور میاں ہدایت کا۔ تیسرا مرزا جان جاناں مظہر، میر عبدالحی تاباں۔ مرزا محمد رفیع سودا۔ مرزا فاخر مکیں، خواجہ میر درد۔ میر ضاحک۔ خواجہ میر اثر، میر سوز اور میر تقی میر کا۔ چوتھا جرأت، انشا، مصحفی اور میر حسن کا اور پانچواں ناسخ۔ آتش، مومن، ذوق، غالب، دبیر اور انیس کا۔

لیکن زبان کی صفائی اور بیان کی سلاست نیز زورِ کلام، حسنِ ادا، تاثیرِ شعر اور رفعتِ خیال کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے۔ تو پہلے چار ادوار کو ایک ہی دور تصور کیا جا سکتا ہے۔ میر تقی میر کے نشتروں، خواجہ میر درد کے تصوف آموز اشعار اور سید انشا کی اس غزل کو چھوڑ کر جس کا مطلع ہے۔ ــ

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

اس دور کی شاعری بالعموم ایسے کلام پر مشتمل ہے جس میں شعریت درد و اثر اور حسنِ بیان کی بجائے صنائع و بدائع اور رعایتِ لفظی کی جھلک زیادہ نمایاں ہے۔ مثنوی میر حسن اور سوختہ حالت کو پڑھتے ہوئے بھی بعض مقامات پر زبان سے بے ساختہ واہ نکل جاتی ہے۔ مگر باقی شاعری میں ایسے اشعار خال خال ہی مشکل سے نظر آتے ہیں۔ جیسے جرأت کا سراپا فصاحت و مجسم بلاغت یہ شعر ــ

کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اس سے بات کرنا
ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا

یا خواجہ میر درد کے بھائی خواجہ میر اثر کا یہ دلگداز شعر ــ

دن کٹا جس طرح کٹا لیکن
رات کٹتی نظر نہیں آتی

مرزا محمد رفیع سودا اپنے عہد کے ملک الشعرا تھے۔ صاحب آبِ حیات نے ان کے اس شعر کو بہت اچھالا ہے۔ ــ

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں

لیکن اسی زمین میں اور انہی قافیوں میں عہدِ سودا کے ایک [illegible] شاعر مرزا [illegible] کا یہ شعر ــ

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

سودا کے شعر سے بمراتب بلند اور بدرجہا دلآویز ہے اور فرسنگوں آگے نکل گیا ہے۔

اس بحث کی روشنی میں وہ دور جسے شمس العلماء آزاد نے اردو شاعری کے پانچویں دور کا نام دیا ہے۔ دراصل دوسرے دور یا دورِ حاضر کے آغاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اسے یہ حیثیت عملی طور پر اور زیادہ تر مرزا غالب کی بدولت حاصل ہوئی۔ مرزا غالب طبعاً جدت پسند تھے۔ اور شاعری میں عام روش پر چلنا انہیں منظور نہ تھا۔ انہوں نے انداز بیان میں گوناگوں جدتیں پیدا کیں۔ ان کا طریقِ شعر گوئی ہمعصر شعرا سے جداگانہ ہی تھا۔ اور بدرجہا زیادہ دلنشیں بھی۔ جدت آفرینی کے ساتھ ساتھ زبان کی صفائی بیان کی روانی، الفاظ کی برجستگی اور الفاظ و مضامین کی ہم آہنگی کے معاملہ میں وہ اپنا جواب آپ ہی تھے۔ تعقید کا عیب جس سے ان کے پیش روؤں اور معاصرین کا کلام بھرا پڑا ہے۔ کلامِ غالب میں ایک آدھ شعر کے سوا کہیں نظر نہیں آتا۔

مرزا غالب کی شاعری کے جو اوصاف اوپر بیان کئے گئے ہیں۔ وہ ان کی اکثر غزلوں میں اول سے آخر تک ہر شعر میں پائے جاتے ہیں۔ بطور نمونہ ذیل کی غزل ملاحظہ ہو۔

ــ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا۔

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

امر مسلمہ یہ ہے کہ اس غزل کا جواب اردو کا کوئی شاعر آج تک پیش نہیں کر سکا۔ مرزا داغ جیسا قادر الکلام اور مقبولِ خاص و عام اور سخن طراز بھی غالب کی گرد کو نہ پا سکا۔ اور اس زمین میں کچھ یوں سے اشعار ہی نکال سکا۔

ــ عجب اپنا حال ہوتا جو وصالِ یار ہوتا
کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا

جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا
تمہیں منصفی سے کہہ دو تمہیں اعتبار ہوتا؟

داغ کے ہمعصر اور حریف امیر مینائی نے بھی اس زمین میں طبع آزمائی کی۔ مگر داغ کی طرح ناکام ہی رہا۔ اس ضمن میں مرزا غالب کی دو اور غزلیں درج ذیل ہیں۔ ــ

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

*

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

ایسی ہی سربسر مرصع غزلیں کلامِ غالب میں اور بھی بہت ہیں۔ جو بیان کی ندرت اور شگفتگی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ مگر طوالت کے خوف سے انہیں مضمون میں پیش کرنا مشکل ہے۔ تاہم کچھ متفرق اشعار ذیل میں درج کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جن سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ دوسرے شعرا کے مقابلہ میں غالب کی امتیازی حیثیت کیا ہے۔ ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

*

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

*

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

*

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

*

شب تم جو بزمِ ناز میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

*

کرنے گئے تھے ان سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

*

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

*

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

*

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

*

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

*

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو وہ لہو کیا ہے

*

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے غم
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

*

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

مندرجہ بالا سالم کی سالم غزلیں اور متفرق اشعار اس دعوے کا منہ بولتا ثبوت ہیں، کہ جہاں تک زبان کی سلاست و صفائی اور بیان کی شگفتگی و برجستگی کا تعلق ہے۔ غالب نہ صرف اپنے پیشروؤں پر فائق ہے۔ بلکہ اپنے معاصرین سے بھی بہت آگے ہے۔ زیادہ صحیح یہ ہے، کہ یہ اندازِ بیان کا جسے غالب کے بعد آنے والے شعرا نے عمومیت کے ساتھ اختیار کر لیا غالب کی ایجاد ہے۔ شعر کو مترنم الفاظ کا لباس پہنانا اور اسے شعریت مجسم بنانے میں غالب ان سب پر غالب اور اسم بامسمیٰ نظر آتا ہے۔ اس کے اشعار اصلیت کے حامل بھی اور جوش و تاثیر کے بھی۔ مندرجہ ذیل قطعہ میں دنیا سے بیزاری کا اظہار کتنے پُرجوش اور دلنشین پیرایہ میں کیا گیا ہے۔ ؎

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

مگر یہ کہنا اصلاً مبالغہ نہ ہو گا کہ غالب نے حسنِ بیان اور زورِ کلام میں کسی اور کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ غالب کا مشہور شعر ہے۔ ؎

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

مرزا داغ کا یہ شعر یقیناً اس شعر سے بلند تر ہے۔ ؎

جاتے تھے منہ چھپائے ہوئے میکدے کو ہم
آتے ہوئے اُدھر سے کوئی پارسا ملے

داغ کا یہ شعر بھی ؎

کیا کیا فریب دل کو دیئے اضطراب میں
ان کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

غالب کے اس شعر سے کمتر نہیں ؎

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

لیکن اس حقیقت کے باوجود کہ داغ اپنے عہد کا بہترین غزل گو اور صاحبِ طرز شاعر تھا یہ ماننا پڑے گا کہ بحیثیتِ مجموعی اسے غالب کا ہم پلہ قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔

غالب کی عظمت اور اس کے کلام کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے۔ کہ ہندوستان کی کئی زبانوں کے علاوہ دوسرے ملکوں کی زبانوں میں غالب کے ایڈیشن شائع اور لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو چکے ہیں۔ اور اب بھی ہو رہے ہیں۔ جتنی شرحیں دیوانِ غالب کی لکھی گئی ہیں۔ آج تک اردو کے کسی اور شاعر کے کلام کی نہیں لکھی گئیں۔ مگر یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ شارحین نے کلامِ غالب کے محاسن کو اصولِ فن اور فنی بلاغت کے نقطۂ نگاہ سے واضح کرنے پر پوری توجہ نہیں کی۔ عملی طور پر سب کی سب شرحیں درسی نوعیت کی ہیں۔ اور ادیب فاضل وغیرہ کے امیدواروں کو امتحان میں پاس ہونے کے قابل بنانے کے لئے مقصود ہیں۔ ذوقِ شعری کی تسکین اور نشوونما ان شرحوں سے نہ ہونے کے برابر ہوئی ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کی توفیق حضرت مولانا حالی کو ہوئی۔ جو غالب کے عزیز ترین شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی سیر حاصل تصنیف "یادگارِ غالب" میں محاسنِ کلامِ غالب پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

غالب کو عیاں کرنے میں اوّلیت کا سہرا غالباً ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری کے سر ہے۔ لیکن اس ضمن میں انہوں نے سو اسو صفحوں کی جو کتاب لکھی۔ اسے شروع سے آخر تک پڑھ جانے کے بعد بھی غالب کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں ناظرین کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ البتہ وہ یہ تاثر لے سکتے ہیں۔ کہ ڈاکٹر موصوف کا مطالعہ مغربی شاعری بہت وسیع ہے۔ اشعارِ غالب کے فنی اور دوسرے محاسن کھول کر واضح کرنا تو ایک طرف۔ اس کتاب میں حوالہ بمشکل چار سے زیادہ شعر پیش کئے گئے۔ اردو کے دوسرے انگریزی داں نقادوں بھی ڈاکٹر صاحب سے آگے نہیں بڑھے۔ اور شیکسپیئر و ملٹن وغیرہ مغربی شعرا کے نظریے اور تجربے پیش کرنے تک محدود رہے ہیں۔

آج کل بھی جب کہ ملک بھر میں اور بیرونی ممالک کے اردو نواز حلقوں میں غالب کی صد سالہ برسی منائی جا رہی ہے۔ غالب پر جو مقالے لکھے اور پڑھے جا رہے ہیں ان میں بھی غالب کی شاعرانہ عظمت اشعارِ غالب کی خوبیاں اجاگر نمایاں کرنے کی بجائے اِدھر اُدھر کی باتوں کو زیب داستان بنایا جا رہا ہے۔ مثلاً غالب کے عادات و خصائل کیا تھے۔ ان کے مذہبی عقائد کیا تھے۔ ان کی طرزِ ماند و بود کس قسم کی تھی وغیرہ وغیرہ۔ اکثر مقالہ نگاروں نے اپنے خیال کی تائید میں غالب کی غزلوں کے اشعار کا حوالہ دینے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ حالانکہ ہر سخن فہم اور ہر ادب دوست جانتا ہے کہ شعرا کی غزلیں ان کی زندگی اور ان کے عادات و خصائل و مذہبی عقائد کا آئینہ نہیں ہوتیں۔ امیر مینائی اور ریاض خیرآبادی باوجود کمال پابندِ شریعت۔ متقی اور پرہیزگار تھے۔ مگر انہوں نے مے نوشی و مے پرستی کے باب میں ایسی ایسی خیال آرائیاں کی ہیں کہ بڑے سے بڑا رند بلانوش بھی کیا کرے گا۔ یک آدھ نے یہ فتویٰ بھی دے ڈالا کہ وہ پرلے درجے کا بزدل۔ بےغیرت اور غدار تھا۔ ان ستم ظریفوں کو کون سمجھائے کہ یہ سب باتیں فالتو ہیں۔ اور بعض حضرات نے تو ستم ظریفی کی انتہا کر دی ہے۔ انہوں نے اشعارِ غالب کی بنا پر غالب کے سیاسی کردار اور مجلسی اخلاق کا تجزیہ بھی کر ڈالا ہے۔ اور یہ بحث چھیڑ دی ہے کہ غالب خود دار اور آزادیِ وطن کا پرستار تھا یا مجمل گوڈی اور غدار۔ ان حضرات کو کون سمجھائے کہ غالب کی شاعرانہ عظمت کے موضوع سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ (میلارام وفا)

میلارام وفا

عظمتِ غالب

ہر نکتہ شناس ہر سخن فہم	ہے معترفِ کمالِ غالب
اردو کیلئے ہے مایۂ ناز	شخصیتِ بےمثالِ غالب

غالب کے دوام کی کفالت
ہے شہرتِ لازوالِ غالب

غالب کو سمجھنا ہو تو پڑھیے	حالی کی یادگارِ غالب
غالب کا کلام بےبدل ہے	سرمایۂ افتخارِ غالب
غالب کے کمال پر گواہ ہے	اشعارِ آبدارِ غالب
ایسے اشعار ہیں بکثرت	کہیے جنہیں شاہکارِ غالب
خورشید و قمر بجز وہ زن ہے	بر دورۂ راہگذارِ غالب
آرائش گیسوئے سخن تھا	شغلِ لیل و نہارِ غالب
حق کا کہ حیات بخش فن تھی	طبعِ اعجاز کارِ غالب
کشافِ رموزِ معرفت تھا	کلکِ جادو نگارِ غالب
ہوتا ہے اگر کیا غلط ہے	پیغمبروں میں شمارِ غالب

اربابِ ذوق کے لئے ہے
سجدے کی جگہ مزارِ غالب

*

سجاد ظہیر

غالب میری نظر میں

مجھے یاد ہے کہ آج سے تقریباً چالیس برس پہلے جب میں تعلیم کی غرض سے انگلستان جانے لگا تھا تو چند درسی کتابوں کے علاوہ میرے ساتھ دو کتابیں اور بھی تھیں ۔ ایک تو قرآن، جو میری والدہ نے برکت کی غرض سے میرے سامان میں رکھ دی تھی اور دوسری تھی دیوانِ غالب ۔ اور اگر آج بھی مجھ سے کہا جائے کہ میں بہت دنوں کے لئے کسی دور دراز مقام پر رہنے کیلئے جاؤں، اور صرف ایک کتاب اپنے ساتھ لے جا سکوں، تو ''انتخاب میں دیوانِ غالب کو ہی چنوں گا ۔'' اچھے اور بڑے ادب کی ایک پہچان یہ ہے کہ وقت گذرنے سے پرانا نہیں ہوتا ۔ اور انسان جس بھی حالت میں ہو، جہاں بھی رہے، جس بھی کام میں مشغول ہو، اس قسم کا ادب اس کی ذہنی، جمالیاتی اور روحانی تسکین کا سامان فراہم کرتا رہتا ہے ۔ اپنی جوانی کے دنوں میں میری تین اہم مشغولیتیں تھیں ۔ پہلے تو اکتسابِ علم جو یونیورسٹی کی نصابی تعلیم کے علاوہ بہت سارے لٹریچر، کتابیں، رسالے پڑھنے، میوزیموں میں جانے اور نئی نئی جگہوں، نئے نئے ملکوں کی سیر و سیاحت وغیرہ پر مشتمل تھا ۔ دوسرے اپنے وطن کی آزادی کی جد و جہد میں کسی نہ کسی طرح حصہ لینے، اور سیاسی مسائل کو سمجھنے اور رفتہ رفتہ عوامی انقلابی تحریک میں شامل ہونے اور اپنے مقدور اور صلاحیت کے مطابق، اس تحریک کو پھیلانے بڑھانے اور مضبوط کرنے میں، اور تیسری مشغولیت تھی، دوستی، رفاقت، عشق و محبت کے کوچوں میں والہانہ سرگشتگی، صفحۂ قرطاس پر جب ان کا ذکر کرتا ہوں تب یہ الگ الگ معلوم ہوتی ہیں ۔ لیکن فی الحقیقت یہ ایک واحد زندگی کے مختلف لیکن ایک دوسرے سے ملے جلے رخ تھے ۔ ایسی زندگی جو اپنی تمام گوناگونی کے ساتھ اس معاشرت کی حیاتِ اجتماعی، اس کی جد و جہد، پیچ و خم، اس کی کبھی مدھم اور آہستہ اور کبھی تیز اور پرجوش موجوں اور کبھی کبھی سطحی اور کبھی کیفیتوں سے بندھی ہوئی تھی ۔ جن کے درمیان حالات اور وقت نے مجھے پھینک دیا تھا ۔

کلامِ غالب کی انقلابی اہمیت

آج میں خود سے سوال کرتا ہوں کہ غالب نے میری اس زندگی پر، اور میری طرح کے دوسرے ''غالب آشنا'' نوجوانوں کی زندگی پر کتنا اور کیا اثر ڈالا ۔

انسانی نفسیات کا یہ بہت پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے کہ فنونِ لطیفہ ہم پر کس طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں ۔ موسیقی، رقص اور نغمے کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے اور شعر بھی انسانی تہذیب کے ارتقا میں انہیں کا ایک شاخسانہ ہے ۔ جو بعد کو ایک مستقل فن بن گیا ۔ کہ ان تمام فنون کا تعلق قدیم انسانی گروہوں کی اس کوشش اور کاوش سے تھا جو وہ اپنی زندگی کی پیداواری قوتوں نیز انسانی نسل کو برقرار، محفوظ اور جاری رکھنے کے لئے کرتے تھے ۔ اور ہزاروں بلکہ لاکھوں برس گزر جانے کے بعد بھی، اور فن محض کے رجعتی اور ظلمت پرست دعوے داروں کے باوجود، اور ان لوگوں کے باوجود جو فن کا رشتہ ہماری اجتماعی اور انفرادی حیات سے توڑ کر اسے بے روح خلائے مطلق میں معلق کر دینا چاہتے ہیں ۔ اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ فن کی بہترین تخلیقات اگر ایک طرف زندگی کو زیب و زینت بخشتی ہیں، اسے زیادہ حسین اور لطیف اور پرنور بناتی ہیں، تو دوسری طرف وہ رفتارِ حیات کو تیز کرکے ہمیں اس جانب بڑھنے میں، ذہنی اور روحانی اور نفسیاتی طور پر مدد کرتی ہیں، جو کسی خاص زمانے اور ماحول میں انسانوں کے تمدنی اور تہذیبی ترکیب و ترتیب کا اعلیٰ ترین نصب العین

ہوتا ہے۔ ان دو پہلوؤں کو (یعنی ہندوستان کے حساس نوجوانوں کی تیس چالیس سال پہلے کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات، نیز شعر و فن کے اعلیٰ ترین منصب) مدِ نظر رکھتے ہوئے اب ذرا غالب کے کلام پر نظر ڈالئے، تب آپ کو اس کی عظیم انقلابی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔

انسان کی عظمت کا اعلان

سب سے پہلے ہمیں جو چیز غالب کے کلام میں متاثر کرتی ہے وہ انسان کی اہمیت ہے۔ غالب انسان کو کائنات کی اہم ترین شے سمجھتا ہے۔ اور اس کی غالباً سب سے زیادہ قابلِ توجہ اور غیر معمولی خصوصیت یہ ہے کہ ایک ایسے زمانے میں جبکہ ہندوستان سیاسی اور سماجی اعتبار سے، انتشار و افتراق کا شکار تھا، اور اس کے حکمراں جاگیردار طبقے کی ذلالت اور پستی، ناچاری، بے بسی اور کمزوری کی وجہ سے تحت الثریٰ کو پہنچ گئی تھی۔ ایسے جاں گسل ماحول میں بھی غالب، انسان کی عظمت کا نعرہ بار بار بلند کرتا ہے

زنا گرم ست این ہنگامہ بنگر شورِ ہستی را
قیامت می دمد از پردۂ خاکی کہ انسان شد

(انسان ایک خاک کا پردہ ہی تو ہے، لیکن جب یہ خاک انسان کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو پھر وہ قیامت برپا کر دیتی ہے، ہستی کے شور کو تو دیکھو، ہماری ہی وجہ سے تو یہ ہنگامہ گرم ہے!)

اور اسی انسانی عظمت کا اظہار غالب نے ایک دوسرے شعر میں یوں کیا ہے:۔

ز آفرینشِ عالم غرض جز آدم نیست
بگردِ نقطۂ ما دورِ ہفت پرکار است

(دنیا کی آفرینش کا مقصد انسان کے سوا اور کچھ نہیں ہے، ہماری ہی نقطہ کے گرد ساتوں آسمان گھوم رہے ہیں)

آج مغرب کے سامراجی اور زوال پذیر سرمایہ داری نظام کے ابتذال اور اس سے پیدا ہونے والے انسانیت دشمن نظریوں اور خود اپنی محرومیوں سے متاثر ہو کر ہمارے اپنے ملک میں ادیبوں اور شاعروں کا ایک گروہ، انسان کی تذلیل و حقارت اور انسانی زندگی کے مہمل اور بے معنی ہونے کی باتیں کرنے لگا ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ غالب کے زمانے کے ہندوستان میں زندگی آج سے کہیں زیادہ مشکل اور پر صعوبت تھی۔ اور ہمارے سیاسی اور سماجی مسائل آج سے کم الجھے ہوئے نہیں تھے لیکن غالب نے اس دشوار ماحول میں زندہ رہنے کے باوجود انسان کی عظمت اور اہمیت سے منہ موڑ کر انکار نہیں کیا بلکہ اپنے کلام میں اسے کائنات کا اہم ترین نقطہ قرار دیا اور اس کی جد و جہد اور کاوشِ حیات کو اپنی فکر کا مرکزی نقطہ بنایا۔

غالب کے نزدیک انسان کی یہ اہمیت محض خیالی نہیں ہے نہ ان کی انفرادی اور اجتماعی مسائل پر بھی نظر ڈالتا ہے۔ اور اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ انسان صرف اپنی حرکت اپنے عمل اور اپنی جد و جہد کے ذریعہ سے انسانیت کی سطح کو اس کی موجودہ پستیوں سے نکال کر بلند تر سطح پر لے جا سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

غالب کو اس کا احساس تھا کہ انسان کو تہذیبِ نفس اور مدنیت کی بہت سی دشوار گذار منزلوں سے ابھی گذرنا باقی ہے ابھی تو وہ آدمی سے انسان بھی نہیں بنا ہے۔ انسان بننے کے لئے اپنی بہیمیت، درندگی، جہالت اور وحشت، مادی کم مائیگی اور ذہنی بے بضاعتی سے نکلنے کے لئے اسے بہت سی پُرخار وادیوں سے گذرنا ہوگا اور بہتیرے جاں لیوا مرحلوں کو سر کرنا پڑے گا۔ اور انسان کی اس لافانی کوشش و کاوش، جانکاہی اور جاں سپاری کے نقوش جن کو عشق و محبت کے سرشکِ خونیں سے رنگینی حاصل ہوتی ہے* اور اسے بلند و ارفع منزلوں کی جانب لے جانے کی سعی اور قربانی انسانی ضمیر کا درخشاں ترین جوہر نظر آنے لگی۔

جنوں کی حکایات خونچکاں

انسانی آزادی کے مجاہدین کا اس سے بہتر نعرۂ حق اور کیا ہو سکتا تھا:۔

جاں مطربِ ترانۂ "ہل من مزید" ہے
لب پردہ سنجِ زمزمۂ "الاماں" نہیں
ہے ننگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

* غالب نے انتہائی حیرت انگیز پُرکشش اور طرزِ ادا کی دلکشی کے ساتھ کھینچے، جس سے زندگی کا وقار پہلے سے دوبالا ہو گیا۔

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

...حال آج جب ہم ان شعروں کو پڑھتے ہیں، تو ہمارا خیال ...ے مجاہدینِ حریت کی طرف جاتا ہے جنہوں نے اپنے آہنی عزم اور شجاعت اور بے مثال قربانیوں سے صرف اپنی قوم کو ہی نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی کو سربلند و سرفراز کر دیا ہے اور سامراجی بربریت ...ظلم، وحشت اور بربریت کی کلائی مروڑ کر یہ ثابت کر دیا کہ "ہر جنگ میں آخری فتح" "اہلِ ہوس" کی نہیں بلکہ "صحیح کشتۂ عشق" کی ہی ہوگی اور یہ کہ ان کا ہی جو خونچکاں پرچم "اہلِ تمنا کیلئے" "صد نشاں" رہے گا۔ یہ اور اسی قسم کا کلام خود ہمارے اپنے وطن کے جہادِ آزادی میں ہمارے دلوں کو گرماتا تھا اور ہمارے خون کی گردش تیز کرتا تھا۔

پھر جب میں ہندوستانی دانشوروں کی اس جد و جہد کا خیال ...تا ہوں، جسے ادب کی ترقی پسند تحریک کا نام دیا گیا، یہ تحریک ...انقلاب و عمل، تجدیدِ حیات، روشن خیالی، جمہوریت اور ...اشتراکیت کی پیامبر ہے اور جس کا مقابلہ رجعت و ظلمت کی ...ان طاقتوں سے تھا جو تشدد و جبر، مکر و دغا، ریا اور دروغ اور روایت پرستی کے تمام حربوں کو استعمال کر کے اس تحریک کو ...دبا دینا چاہتی تھیں۔ تب بھی ہمارا سب سے بڑا سہارا اور انسپریشن ...غالب ہی کا کلام تھا، جس نے ہم سے کہا تھا:۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

...ہمیں جب تشدد و جبر کا مقابلہ کرنا پڑا تب موجودہ عہد کے ...ترقی پسند شاعر نے زندانِ الم سے بے دریغ یہ آواز بلند کی کہ:۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

...شخص محسوس کر سکتا ہے کہ فیض کے اس شعر میں غالب کی سی ...فکر کا منزل ہے۔ حق اور انصاف، انسانی آزادی اور عروجِ ...یت کے عظیم کاروان کی جس میں ہم مشغول تھے، غالب نے ...بتایا کہ یہ انسان کی شریف ترین کاوش ہے اور انسان کی عظمت ...اسی میں ہے کہ وہ ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کرنے اور مصائب کو جھیلنے کے باوجود اس میدان سے پیٹھ نہ موڑے:۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

غالب کے عہد کا ہندوستانی سماج

عافیت کوشوں، مصلحت اندیشوں، روایت پرستوں کو غالب نے حقارت کی نظر سے دیکھا اور کہا کہ یہ گروہ نہیں بلکہ وہ لوگ عزت کے قابل ہیں جو بلند انسانی نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے ہر طرح کی مصیبتیں جھیلتے ہیں، قربانیاں کرتے ہیں اور استقلال اور استقامت کے ساتھ اپنی راہ پر گامزن رہتے ہیں:۔

رشک بر تشنۂ تنہا رو وادی دارم
نہ بر آسودہ دلانِ حرم و زمزم شاں

(مجھے تو اس مسافر پر رشک آتا ہے جو اکیلا بھی ہے اور پیاسا بھی (لیکن اپنا سفر طے کرتا جاتا ہے) حرم کے آسودہ دلوں پر نہیں اور ان کے زمزم کے چشمے پر)

اسی مضمون کو ایک دوسرے مشہور شعر میں غالب نے یوں پیش کیا:۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

غالب آج سے ڈیڑھ دو سو برس پہلے ہندوستانی سماج کا ذکر تھا، اور یہ سماج اس زمانہ میں آج سے بھی زیادہ قدامت پرستی توہم بے عقلی اور فرسودہ رسوم و رواج کی زنجیروں سے بندھا ہوا تھا۔ آج بھی نئی زندگی کی تعمیر میں ہم ان زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آج بھی ذات پات، مذہب دھرم، رنگ نسل، زبان اور کلچر کی دیواریں انسانوں کو برابری اور محبت کی سطح پر ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور زندگی کو وسیع تر اور بہتر بنانے سے روکتی ہیں۔ لیکن غالب ہم سے کہتا ہے:۔

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

اور اس نے یہ آواز بلند کی :-

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم
اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم
وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم
بہ جنگ باج ستانانِ شاخساری را
تہی سبد ز درِ گلستاں بگردانیم

(آؤ ہم تم مل کر آسمان کے طور و طریقوں اور روش کو پلٹ دیں، اور اپنے بڑے شراب کے پیالے کو گردش میں لاکر قضا اور قسمت کو بدل دیں .... اگر شحنہ (حاکم شہر یا جابر حکمراں) سے ہماری لڑائی ہو تو اس کی فکر نہ کریں، اور اگر خود بادشاہ ہمیں تحفہ بھیج کر ہماری زبان بند کرنے کی کوشش کرے تب اس کے تحفہ کو لوٹا دیں، ہم جنگ کریں اور ان لوگوں (شریروں اور ظالموں) کو جو ہماری عیدوں سے ہری شاخوں سے (حیلہ و رشوت) خراج وصول کرتے ہیں، گلستاں سے خالی جھولیاں لئے واپس جانے پر مجبور کر دیں)

سب سے اچھا ساتھی اور رفیق

اگر ہم غالب کے کلام کے مجموعی تاثر اور اس کی فکر کے بنیادی عناصر کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں تو ہمیں اس میں کائنات فطرت اور حیات کا بڑا ہی متحرک، رنگین، ارضی اور مادی تصور نظر آتا ہے، جو ہر لحظہ اپنی شکست و ریخت، اور تعمیر نو کے ذریعہ سے ارتقا پذیر ہے۔ اور جس میں انسان کے سینے میں موجزن عشق و محبت کا جذبہ اور آرزو اور تمنا اور شوق نئی سے نئی اور کم تر سے زیادہ آسودگی حاصل کرنے کی کاوش میں زندگی کو بہتر ناک حسن اور دلکشی عطا کرتے ہیں۔ غالب اگر ماتم کرتا ہے تو وہ "ماتم یک شہر آرزو" ہے۔ اور وہ فطرت کا حسن ہے جو شاعر سے اس کی نوازی کا سوال کرتا ہے

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

اور غالب اپنی آنکھوں کو "ہر رنگ" میں کھلی رکھنا چاہتا ہے :-

نظارہ ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

میں نے تب انسان کی تمام امکانی ترقیوں، بلندیوں، پہنائیوں اور اس کے شوق و آرزو کی تمام ممکنہ آسودگیوں اور تسکینوں کو ناکافی سمجھا ہے اس کے معنی یہی ہیں کہ وہ انسان کے ذوق و کاوش کی کوئی آخری منزل نہیں دیکھتا، بلکہ وہ اس کی مسلسل اور لامتناہی انفرادی اور اجتماعی روحانی اور مادی حرکت و رفتار اور پیش رفت کا پیغامبر ہے۔ وہ ہمارے دلوں میں ایک آفاقی بے چینی اور بے اطمینانی پیدا کرکے ہماری زندگی کو ہمیشہ اور ہر لحظہ پہلے سے زیادہ پر معنی، زیادہ آزاد اور زیادہ پرجمال و پرتمکنت دیکھنا چاہتا ہے۔ ہم کبھی اس کا یہ لافانی شعر فراموش نہیں کر سکتے :-

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب !
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

غالب کے شعر وفن کی یہی جولانی اور تابندگی تھے جاودانی بخشتی ہے، وہ ہماری حیات کے لطیف ترین پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے، وہ اسے مزین کرتا ہے۔ رفتار و حرکت کی جانب مائل کرتا ہے۔ اور دنائیوں، پستیوں، محرومیوں سے نبرد آزما ہوکر تازہ بتازہ اور نو بہ نو بلندیوں کی طرف اٹھانے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے وہ ہر حال اور ہر رنگ میں ہمارا سب سے اچھا ساتھی اور رفیق رہا ہے۔ اسی لئے ہم اس کی عزت کرتے ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

پروفیسر سید احتشام حسین

غالب کے نغموں میں وحدتِ انسانی

ہر زبان اور قوم کی شاعری میں وہ قدیم ہو یا جدید، تشبیہوں اور استعاروں، علامتوں اور تمثالوں، تلمیحوں اور تمثیلوں سے کام لیا گیا ہے۔ ایک حیثیت سے یہ اظہار کے فطری سہارے اور ساز معنی کے پیچھے ہوئے پردے ہیں۔ جن سے شاعر اپنے پیرائے بیان میں معنی کی بجلیاں پیدا کرتا ہے۔ ہر شاعر اپنے شعور اور ذہنی ذہن کے مطابق انہیں تاریخ، تہذیب، رسم و رواج، مذہبی عقائد، قصص و حکایات اور تخیلی مفروضات سے حاصل کرتا ہے اور اپنے تجربات کے اظہار کا وسیلہ بناتا ہے۔ فارسی اور اردو شاعری میں شیخ و برہمن، کعبہ و کلیسا، بادہ و ساغر، قفس و آشیاں، دشنہ و خنجر، زمین و فلک، وحشت و صحرا، گل و بلبل، آئینہ و رنگ، عشق و جنوں، زنجیر و صوفی کے تذکروں سے بھری پڑی ہے۔ اور شاعروں نے انہیں سے اپنی بزم فکر سجائی ہے۔ اور انہیں کو نئے نئے رنگ دیکر اپنے تجربات کی دنیا آباد کی ہے۔ مرزا غالب کی معنی آفرینی بھی بہت کچھ انہیں علامتوں اور تمثیلوں کی رہین منت ہے۔ ان کے افکار کی دنیا میں داخل ہونے کیلئے ان سے نہ صرف واقفیت ضروری ہے بلکہ غالب کے طرز فکر اور احساس فن سے انہیں مربوط کرنے کی بھی ضرورت ہے ورنہ ان کی انفرادیت کے خط و خال واضح نہ ہو سکیں گے۔

مرزا غالب کے خیالوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ زمین آسمان دونوں کی خبر رکھتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہتے ہیں اور دونوں کے متعلق سوچتے ہیں۔ وہ زمین سے نکلنے والے لالہ و گل کی ماہیت پر بھی غور کرتے ہیں۔ اور آسمان میں بچھے ہوئے تاروں کے جال کا راز بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان سب کے مدد اور مدعا کیا ہیں۔ یہی وہ فکری عنصر پیدا ہوتا ہے جو انسان اور کائنات کی غرض و غایت کو سمجھنے پر اکساتا ہے۔ اور مذہب کی حقیقت جاننے کا شوق پیدا کرتا ہے۔ دیر و کعبہ، کلیسا اور صنم کدہ، شیخ و برہمن سے دلچسپی اسی ذوق جستجو کا نتیجہ ہے۔ شاعر اور فنکار کی حیثیت سے ان کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز فلسفیوں سے مختلف ہے۔ لیکن اس کی تہ میں یہی کریدھی ہوئی ہے کہ یہ دنیا کیا ہے۔ کہاں سے آئی ہے اس میں انسان کی حیثیت کیا ہے۔ یہ مختلف مذہبوں میں بٹا ہوا کیوں ہے۔ اگر بٹ ہی گیا ہے تو ان میں فرق کیا ہے۔ کیا یہ سب ایک ہی قسم کی روحانی آسودگی کی تلاش میں نہیں ہے۔ اگر سب ایک ہیں تو پھر آپس میں منافرت اور دوری کا سبب کیا ہے؟ یہ وہ سوالات تھے جنہوں نے وید اور اپنشد، قرآن اور انجیل، اوستا اور تالمود کے ماننے والوں کو الجھائے رکھا ہے۔ اور ان فلسفیوں کو بھی جو زندگی کے مظاہر اور راز تلاش کرنے کے در پے تھے...... مرزا غالب نے اپنی نثر و نظم میں کبھی علامتوں اور استعاروں کے پردے میں اور کبھی صاف الفاظ میں کبھی محض ایک تشکیک آمیز سوال کی شکل میں اور کبھی پیرایۂ طنز و لہجہ میں ان سوالات کو چھیڑا ہے۔ کوئی مستقل بحث نہیں کی ہے۔ ان کی اردو شاعری میں دیر و حرم، کعبہ و بت خانہ، کلیسا، کفر اور دین کی علامتیں بار بار آئی ہیں۔ لیکن ان سے باقاعدہ مذاہب کے اختلافات اور خصوصیات اور معتقدات پر بحث کرنا مقصود نہیں، نہ کسی مذہب کو برا، کسی کو اچھا ثابت کرکے دکھانا ہے بلکہ ہر جگہ ان کی مدد سے اس انسانی حقیقت کو سمجھنا ہے کہ اگر سب انسان ہیں تو مذہب کے تفرقے انہیں کس طرح الگ کرتے ہیں۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انہوں نے مذہب کا مطالعہ کتنی گہری نظر سے کیا تھا لیکن ان کی تحریروں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے ہندو مت، اسلام، قدیم زرتشتی عقائد اور صوفیانہ خیالات

کو سمجھنے کی کوشش کی تھی ۔ اور ان میں بعض بنیادی مشترک چیزوں پر غور کیا تھا ۔ اور صوفی سمجھ کر اس مابعد الطبعیاتی نقطۂ نظر کو اپنایا تھا ۔ جسے عام طور پر وحدت الوجود کہا جاتا ہے جس کی رو سے حقیقت ایک ہوتی ہے اس کے مظاہر سیکڑوں ۔ خداؤں کا ظاہری فرق دیر و کعبہ ، کلیسا اور بت خانے کی دیواریں کھڑی کرتا ہے ۔ کہیں ایک ہی ہوتی ہے ۔ اس حقیقت کو مرزا غالب نے ایک صوفیانہ فکری مسئلہ کی شکل میں شاعرانہ انداز سے پیش کیا ہے ۔

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
سر پائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بے خودی
رُو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے
یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

غالب مذہب کے معاملے میں آزاد خیال تھے اور بڑے لطیف انداز میں مذاہب کے ظاہری رسوم پر طنز کرتے تھے ۔ لیکن جہاں تک منزل اور مرکز کا تعلق ہے اس سے غافل نہ تھے ۔ ان کے بعض اشعار اور خیالات سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقت کی کھوج کو انسان کے لئے فطری سمجھتے تھے ۔ لیکن مذہب کے آخری منزل قرار دینے کو شک کی نظر سے دیکھا جانا خیال کرتے تھے ۔ ان کا مشہور شعر ہے

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

اس کی حسین تفسیر ہے ۔ انسان مسلسل جد و جہد کرتا رہے کہ تخلیق اور منشائے تخلیق کے راز دریافت کرلے ۔ یہ شوق جہاں تھک کر پناہ لیتا ہے اس کا نام مذہب رکھ دیا گیا ہے ۔ اور چونکہ اب بار بار ہوتا رہا ہے اس لئے دنیا میں سب سے مذاہب وجود میں آگئے ہیں ۔ چونکہ ان سب کے پیچھے تلاش کا ایک ہی جذبہ کام کر رہا ہے ۔ اس لئے ان کے ماننے والوں میں کوئی جھگڑا نہیں ہے ۔ اصل قدر تو اس جذبے کی کرنی چاہیے جو ثابت قدمی کے ساتھ اس جستجو میں سرگرداں ہے ۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مومن اور کافر مندر کے پجاری اور حرم کے پاسبان برہمن اور شیخ میں کوئی فرق نہیں رہتا ۔ انہیں علامتوں سے کام لیکر غالب نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا ہے جو مذاہب کے درمیان رواداری ، جذباتی ہم آہنگی اور اتحاد باہمی کا منشور بن سکتا ہے ۔ کہتے ہیں

وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

اگر کسی شخص نے سچائی اور ایمانداری سے ایک مذہب اختیار کیا اور دوسرے نے کوئی دوسرا تو اس میں جھگڑے کی بات کہاں ہے دونوں سچے ہیں اور دونوں کو ایک ہی برتاؤ کا مستحق قرار دیا جانا چاہیے مسجد اور مندر ، قبرستان اور شمشان کے لئے لڑکر جان دینے والے اگر مذہب کے فرق کو اس نظر سے دیکھیں تو سارے جھگڑے ختم ہو جائیں ۔ مذہبوں کے ظاہری فرق کی تہ میں جو اکیلی سچائی ہے اس کی طرف غالب نے اس طرح اشارہ کیا ہے ۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

مرزا غالب نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ اصل چیز کسی مذہب میں پیدا ہونا یا اس سے بے سوچے سمجھے وابستہ ہونا نہیں ہے بلکہ اس کو سچا سمجھ کر اختیار کرنا ہے ۔ اس سے وفاداری بنتا ہے ۔ عزت اسی کی ہوتی ہے جو مذہب کو سچ سمجھ کر اختیار کرتا ہے ۔ اور کسی لالچ یا ڈر سے اس کے قدم ڈگمگا نہیں جاتے ایک جگہ کہتے ہیں

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

کوئی شخص ہر وقت ہاتھ میں تسبیح لئے ہو یا ہر وقت جنیو میں لپٹا ہوا ہو تو وہ اس سے پاکباز اور ایماندار نہیں ہو جاتا ۔ یہ دونوں عمل ظاہری ہیں ۔ نہ تسبیح والا شیخ شیخ ہے اور نہ جنیو والا برہمن برہمن شیخ اور برہمن کی سچائی کا امتحان اس وقت ہوگا جب انہیں اپنے عمل میں یقین کی جھلک بھی نظر آئے ۔ اس ڈر سے عبادت کرنا کہ اگر اس میں کمی ہوئی تو جہنم میں پھینک دیا جائیگا اس لالچ میں نمازیں پڑھنا کہ خدا خوش ہو جائے گا اور جنت میں بخش دے گا ۔ عبادت کی روح کے منافی ہے ۔ یہ عبادت ڈر اور لالچ کی پیداوار ہے ۔ ان سے بچ کر جو عبادت کر سکے ۔ وہ قابلِ عزت ہے ۔ مرزا غالب نے اپنا ایک لاجواب شعر میں اس حقیقت کو یوں پیش کیا ہے ۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لیکر بہشت کو

جس شخص کا یہ عقیدہ ہو وہ جنت اور جہنم کو کیا اہم قرار دے گا کیا کرے کیونکہ یہ بھی عبادت کی راہ میں حائل ہوتے ہیں ۔ غالب نے شاعرانہ انداز میں یوں بھی طنز کیا ہے جو انہیں ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں ۔ ایک جگہ کہا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

دوسری جگہ لکھتے ہیں

کیوں نہ دوزخ کو بھی جنت میں ملا لیں یا رب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

بنیادی طور پر یہ ساری باتیں اس ایک خیال کا جز ہیں کہ مذہب کی روح جنت اور دوزخ ، کعبہ اور دیر ، زمزم اور جامۂ احرام کی اہمیت بہ نسبت مذہب سے کم نہیں ہوتی کیونکہ یہ ساری چیزیں ظاہر پرستی سے تعلق رکھتی ہیں اور مذہب کی محض رسمی علامتیں ہیں ۔ چند اشعار سے غالب کا نقطۂ نظر واضح ہو جائیگا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے سے اٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو ، کوئی خانقاہ ہو

جو لوگ غالب کے طرزِ فکر اور انداز بیاں سے واقف ہیں انہیں اندازہ ہوگا کہ یہ اشعار محض شگفتہ مزاجی ، رند مشربی یا اظہار آزاد روی کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کے پیچھے انسانیت پرستی کا ایک عظیم الشان تصور کام کر رہا ہے ۔ یہ تعصب ، فرقہ پرستی ، تنگ نظری ، نسلی افتراق ، قومی اختلافات اور انسان دشمنی کے جذبات پر کاری ضرب لگاتا ہے اور جب غالب جیسے فنکار کے لفظوں میں ڈھل جاتا ہے تو زمین آسمان کی حدیں مل جاتی ہیں اور ان سے وحدتِ انسانی اور آفاقیت کے گُر نکلتے ہیں ۔

(بشکریہ اردو مجلس آل انڈیا ریڈیو دہلی)

غالب اکیڈمی

"غالب اکیڈمی" — غالبیات کے سلسلہ کی ایک ایسی کوشش ہے جس نے غالب کی یادگار کو ایک دائمی استحکام بخش دیا ہے۔ بستی نظام الدین کے ایک گوشہ میں آرام فرما غالب جب دُنیا کے تذرع سے اپنی ابدی آرام گاہ کے پہلو میں ایک عالیشان عمارت کی تعمیر دیکھیں گے۔ جو ان کے عہد یا ان کی ذات یا ان کے کلام پر نئے انداز سے روشنی ڈالنے کا سبب بنے گی، جو ان کی شان کے شایان ہوگی۔ جس میں غالبیات پر میوزیم ہوگا۔ لائبریری ہوگی ایوان کے سلسلہ میں ہونے والے پروگراموں کے لئے آڈیٹوریم ہوگا۔ تو یقیناً زبانِ شعر میں بے اختیار پکار اُٹھیں گے ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

غالب کے سلسلہ میں یہ تعمیری کام ایک ایسی دور اندیش شخصیت کے ہاتھوں انجام پا رہا ہے جو دُنیائے طب میں عصر حاضر کی ایک عظیم ترین شخصیت ہے۔ اور اب اس کام کے مکمل ہونے کے ساتھ ہی دنیائے ادب میں بھی اپنی پُرخلوص درخشاں و تابندہ ذاتِ گرامی اور اپنے عزم کامل نیز جہد پیہم کے سبب بالکل منفرد ہوگی۔

حکیم عبدالحمید صاحب (چیرمین ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن) کا نام ذہن میں آتے ہی ایک ایسا چہرہ نگاہ میں گھومتا ہے۔ جو آصف علی روڈ کے ہمدرد نرسنگ ہوم اور ہمدرد دواخانہ لال کنواں کے اوقاتِ مطب میں مایوس مریضوں کو زندگی، حوصلہ اور حرارت تقسیم کرتا ہے۔ جو فرداً فرداً ہمدرد نرسنگ ہوم کے اندر مریضوں کے پاس جاتا ہے تو اس کا جاں نواز تبسم بیماروں کی ناامیدی کو امید میں بدل دیتا ہے۔ جو پیہم اور مسلسل تحقیق و جستجو کر کے طبِ یونانی کے مقام کو بلند سے بلند تر کر رہا ہے جو تاریخ طب کے سلسلہ میں ایک عظیم اسکیم (انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ) کو تکمیل کے مراحل طے کرا رہا ہے۔ جو مذہب اسلام پر ایک انسٹی ٹیوٹ (انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز) کا بانی ہے اور اتنے بہت سے کاموں کے بار کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ جس کا ادبی ذوق بہت بلند اور مطالعہ بہت عمیق۔

غالب اکیڈمی کا خاکہ اس شخصیت نے ۱۹۳۶ء میں مرتب کیا تھا۔ آج جب ۳۳ سال بعد اس خواب کی جیتی جاگتی تعبیر سامنے آ رہی ہے تو مستقبل کا مورخ قلم سنبھالے تیار بیٹھا ہے کہ اس کارنامہ کو جلی سرخیوں سے قلمبند کرے۔ اور حکیم عبدالحمید صاحب کا یہ کارنامہ اردو ادب کیلئے ایک ایسی منزل کا پتہ دے جس پر بجا طور پر ناز کیا جائے۔

اس عظیم کام کو استحکام بخشنے کیلئے ضروری ہے کہ غالب کے عقیدت مند سامنے آکر بقدر حیثیت اس مہم میں حصہ لیں اور حکیم صاحب کے علمی ایثار کے نتیجے میں ممکنہ مالی تعاون فراہم کریں یہ ایک عظیم اسکیم ہے جس کے لئے حکیم صاحب موصوف نے [illegible] سے اس مقصد سے ضروری سمجھی اپنی زمین (دو لاکھ روپے کی مالیت کی)، عطا کرنے کے علاوہ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن سے [illegible] روپے دیا ہے۔ اس اسکیم پر لاکھوں روپے خرچ ہوں گے۔ اس میں تعاون کی پیشکش کرنے والے حضرات سے اپیل ہے کہ غالب اکیڈمی ہمدرد بلڈنگ لال کنواں دہلی نمبر ۶ سے رجوع کریں۔

غالب پر کام کرنے والے طالب علم، ریسرچ اسکالر اور وسیع مطالعہ کا ذوق رکھنے والے اس اکیڈمی سے مستفید ہوں گے۔ اور اس طرح یہ ایک ایسا بین الاقوامی انسٹی ٹیوٹ ہوگا

مالک رام

غالب ۔ شخصیت اور شاعری

اسداللہ خاں غالب ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے وہ ایک معزز ترکمان گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ جو اٹھارویں صدی کے وسط میں وسط ایشیا سے ترک وطن کر کے ہندوستان آیا تھا۔ وہ اپنا سلسلۂ نسب ایران کے ایک قدیم پیشدادی خاندان سے ملاتے تھے لیکن ان لوگوں کی تاریخی حیثیت بھی مسلّم اور واضح ہوتی ہے۔ ان کے بیشتر اجداد نے فوج میں ملازمت کا پیشہ اختیار کیا۔

ان کے جد محمد قسمت آزمائی کیلئے ہندوستان آئے اور لاہور کے گورنر معین الملک عرف میر منّو کی ملازمت اختیار کی۔ کچھ عرصہ بعد وہ دہلی چلے آئے۔ جہاں شاہ عالم ثانی کے دور میں وہ شاہی ملازمت میں لگ گئے۔ دہلی میں مختصر سے قیام کے بعد انہوں نے آگرہ کو اپنا مستقر بنا لیا۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے عبداللہ بیگ خاں کی شادی وہیں کے ایک سابق فوجی سردار کی لڑکی سے ہوئی۔ اسداللہ خاں غالب انکے سب سے بڑے بیٹے تھے۔

دہلی سلطنت کے قیام ہی سے فارسی اعلیٰ طبقہ کی زبان رہی تھی۔ اور اسی لئے ذریعہ تعلیم بھی تھی۔ اور ادبی کاموں کی زبان بھی۔ حسب رواج غالب ایک مدرسہ میں بھیجے گئے جہاں انہوں نے فارسی کا کلاسیکی ادب پڑھا۔ حسن اتفاق سے ایران کا ایک عالم سیاح عبدالصمد سیر و سیاحت کرتا ہوا ۱۸۱۱ء میں آگرہ آیا۔ ۱۴ سال کی عمر میں غالب کو اسی سے فارسی اور غالباً کسی قدر عربی پڑھنے کا موقعہ ملا۔ وہ غالب کے گھر میں دو سال مقیم رہا۔ یہی وہ رسمی تعلیم تھی جو اپنی زندگی میں انہوں نے حاصل کی۔

اسی اثناء میں ان کی شادی دہلی میں ریاست لوہارو کے والی کے خاندان میں ہوئی۔۔۔۔ دارالسلطنت کی کشش ناقابلِ مزاحمت ثابت ہوئی۔ اور ۱۸۱۲ء کے قریب انہوں نے اپنا مسکن آگرہ سے تبدیل کر کے دہلی مقرر کیا۔ اپنی بقیہ زندگی عرصہ اس قدیم تاریخی شہر میں ہی مقیم رہے۔ جو اپنے قیام کے ہزار برسوں کے دوران بہت سے حکمرانوں کا عروج و زوال دیکھ چکا تھا۔

لوہارو کے حکمراں گھرانے میں ان کی شادی ان کے لئے بڑے فائدے کا سبب ثابت ہوئی۔ ان کے خسر الٰہی بخش خاں معروف جو نواب لوہارو احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ ایک مشہور شاعر اور دہلی کے ادبی حلقوں میں معروف تھے۔ خود نواب لوہارو کا دربار دہلی میں اچھا اقتدار تھا۔ ان وسیلوں سے غالب نہ صرف دہلی کے پڑھے لکھے شرفا سے متعارف ہو گئے بلکہ انہیں دربار شاہی کے اندرونی حلقوں میں بھی رسوخ حاصل ہو گیا۔ جو ان کی سسرال کے رشتہ داروں کے اثر و رسوخ کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس زمانے میں ان کے جو تعلقات قائم ہوئے وہ سماجی اور علمی دونوں اعتبار سے پائیدار اور اہم ثابت ہوئے۔ غالب کی شناسائی شاعروں اور عالموں، مدبّروں اور ساہوکاروں، شہزادوں اور مفلسوں سب سے ہوئی جس سے انہیں زندگی کے غموں اور خوشیوں، مصیبتوں اور تکلیفوں، کامیابیوں اور ناکامیوں اور امیدوں اور مایوسیوں کا ایک بھرپور اور متنوع تجربہ ہوا۔

مغل تخت پر اکبر اعظم اور تاج کے معمار شاہ جہاں کی اولاد میں سے ایک ہستی رونق افروز تھی۔ حکمراں خاندان کی وہ اگلی سی شان شوکت تو نہ رہی تھی لیکن اس کے جلوس عظمت کا جو ہالہ تھا اس کی کشش سے مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والے حوصلہ مند لوگ نیک نام کے بادشاہ کی طرف کھنچے چلے آتے تھے جبکہ حقیقی طاقت برطانویوں کے ہاتھوں میں جا چکی تھی۔ جنہوں نے بتدریج اور بجبر جاگیرداروں کی حیثیت سے ملک میں ایک مستحکم مقام اور رتبہ حاصل کر لیا تھا۔ انہوں نے بڑی احتیاط و تدبر سے کھیل کھیلا تھا اور ملک کے مختلف حصوں میں اقتدار کے مالک بن گئے تھے۔

بادشاہ دہلی ان کا وظیفہ خوار تھا، جس کا دائرہ حکومت شہر کی فصیل تک محدود تھا۔ ان حدود میں بھی اپنے احکام کے نفاذ کے لئے وہ برطانیہ کے ایجنٹ پر منحصر تھا۔ دربار شاہی نہ تو اتنا دولت مند تھا کہ کسی کو کوئی بڑا مالی فائدہ پہنچا سکے اور نہ اتنا پر شوکت تھا کہ حقیقی معنی میں کسی اہل فن کے لئے باعث فخر ہو۔

غالب جب دہلی آئے تو ان کی عمر صرف ۱۵ سال تھی۔ آگرہ ہی میں انہوں نے اردو اور فارسی میں لکھنے کا شغل اختیار کر لیا تھا۔ دہلی سے ان کے جو ناطے تھے۔ انہوں نے علم و ادب کے شعبے میں شہرت و عزت حاصل کرنے کے لئے ان کی امنگ کو یقیناً تیز کیا ہوگا۔ اس زمانے میں انہوں نے اسد تخلص اختیار کیا۔

اس زمانے میں انہیں بہت مشکل اور مغلق زبان میں شعر کہنے والے کی حیثیت سے شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ ان کے ہم عصروں کو جو نامانوس زبان کے عادی نہیں تھے شکایت تھی کہ ان کی زبان فہم سے بالاتر تھی اور انہیں مہمل گو شاعر بھی کہا گیا۔ اس دور میں ان پر بعض فارسی شعرا بالخصوص بیدل کا بڑا اثر تھا۔ اور یہ شاعر معنی آفرینی کے لئے مشہور تھے۔ بیدل اورنگ زیب کے معاصر تھے اور ان کا انتقال ۱۷۲۱ء میں ہوا۔ فارسی شاعری میں انہوں نے ایک نیا طرز اختیار کیا۔ روایت پسند شعرا عشق، شراب یا صوفیانہ موضوعات پر طبع آزمائی کرتے رہے تھے۔ اپنی ادبی زندگی کے اس ابتدائی مرحلے پر، غالب، بیدل کے موضوع فکر اور طرز بیان دونوں سے متاثر ہوئے اور انہوں نے اس کا اردو میں تتبع کرنا چاہا۔

فارسی ایک بہت ترقی یافتہ زبان تھی جس نے صدیوں کے نشو و نما کے دوران ایک ایسا ذخیرہ الفاظ و طرز اظہار کر لیا تھا جو نازک ترین خیالات و تصورات کے اظہار پر قادر تھا۔ اردو ابھی ایک حد تک نئی زبان تھی اور اسے بیدل کے سے خیالات کے اظہار کا ایک موثر ذریعہ بننے کے لئے ابھی مختلف ارتقائی مراحل سے گزرنا تھا۔ غالب کا سامنا جب اس مشکل سے ہوا تو انہوں نے اپنے تخیل کے پیچیدہ عمل کے لئے ایک نیا طرز اظہار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ کبھی کبھی زبان نے ان کی اس کوشش کا ساتھ دیا لیکن اس تجربہ کو مکمل اور یکساں طور پر کامیابی نہیں حاصل ہوئی۔ اکثر ایسا ہوا کہ پیچیدہ انداز بیان کے مقابلے میں خیالات مبہم ہو کر رہ جاتے۔

اگر اس راہ پر وہ بے دھڑک چلتے رہتے تو ان کی طباعی و ذہانت رائیگاں ہوتی۔ اور وہ بھی غیر اہم شاعروں کی لمبی صف میں شامل ہو گئے ہوتے۔ لیکن زبان و ادب کی خوش قسمتی سے انہیں اس آزادی کو برتنے کی اجازت نہ دی گئی۔

مشاعروں اور نجی صحبتوں میں ان کے دوستوں اور دشمنوں، دونوں نے یکساں طور پر ان کے کلام کے ناقابل فہم ہونے کی شکایت کی۔ اس پر ان کا جو رد عمل ہوا وہ تو محض حقارت کا تھا لیکن جب ان کے بعض گہرے دوستوں نے بھی انہیں آسان تر انداز اختیار کرنے کا مشورہ دیا تو انہوں نے اس مشورہ کا احترام کیا۔

غالب کے عہد کے مغل بادشاہ، بہادر شاہ ثانی خود بھی اردو کے شاعر تھے۔ ہم عصر شعرا کی جو سرپرستی وہ کر سکتے تھے اس کا کوئی زیادہ فائدہ نہ تھا، تاہم اپنے زمانے کی ادبی دنیا کے وہ نمایاں رکن تھے۔ بہت نوعمری ہی میں انہوں نے محمد ابراہیم ذوق کی ادبی شاگردی اختیار کر کے ان سے مشورہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اپنی زندگی میں غالب بہادر شاہ کے وسیع ادبی حلقے کے ایک ممتاز رکن تھے۔ ۱۸۵۴ء میں ذوق کا انتقال ہونے پر ان کے فرائض کا بار غالب کے کندھوں پر پڑا اور انہوں نے بادشاہ کے ادبی مشیر کا رتبہ حاصل کر لیا۔

بہادر شاہ ۴ سال قبل غالب کو شاہی گھرانے کی تاریخ فارسی میں لکھنے کا کام سونپ چکے تھے۔ اس کام کے سلسلے میں انہیں ۵۰ روپیہ ماہوار کا وظیفہ ملتا تھا۔ بہادر شاہ کی اردو تصنیفات کی تنقیحات کے لئے ادبی مشیر کی حیثیت سے ان کو جو مزید فرائض تفویض ہوئے ان سے غالب کی مالی حالت میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی۔ ساڑھے سات سو روپے سالانہ کی پنشن کے علاوہ جو انہیں اپنے چچا کے ترکے میں ملتی تھی اب انہیں مزید چھ سو روپے سالانہ بادشاہ کی طرف سے ملنے لگا تھا۔ تقریباً سات سال تک ان کی کل آمدنی یہی تھی۔

۱۸۵۷ء میں ملک ایک سیاسی شورش سے گزرا جب ہندستانی عوام اپنے برطانوی آقاؤں کے ہاتھ سے اقتدار چھیننے کی خاطر بغاوت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بہادر شاہ کو پھر شہنشاہ کی حیثیت سے تخت نشین کیا گیا۔ بہت سے ہندستانی امیر جن کی ریاستیں چھین لی گئی تھیں، اس لڑائی میں شریک ہوئے۔ لیکن یہ لوگ ملک کے مختلف حصوں میں بہت محدود علاقوں میں ہی مزاحمت کر پائے۔ کچھ دیر کے لئے تو ایسا لگتا تھا کہ ہندستانی غیر ملکی اقتدار کا جوا اتار پھینکنے میں کامیاب ہو گئے لیکن موزوں تنظیم کی کمی کی وجہ سے لڑائی کا رخ جلد ہی ہندستانیوں کے خلاف ہو گیا۔ اس مدت کے دوران غالب نے بڑی تنگی کے دن گزارے۔ جب باغیوں کا دہلی پر تسلط ہو گیا تو برطانیوں نے ان کی پنشن روک دی۔ بہادر شاہ کی طرف سے انہیں جو وظیفہ ملتا تھا اس کی ادائیگی بھی رک گئی۔ کیونکہ دہلی میں ان کے برطانوی وظیفہ دہندوں کی شکست کے بعد بادشاہ کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں رہا تھا۔ برطانیہ کی طرف سے بادشاہ کے کنبے کے گزارے کے لئے ۱۲ لاکھ روپیہ سالانہ دئے جاتے تھے۔ اس رقم سے شاہی دربار کی ظاہری شوکت قائم رکھنے میں مدد ملتی تھی۔

۱۸۵۷ء کے آخر تک برطانیوں نے عملاً تمام ملک میں اپنے اقتدار کو پھر سے قائم کر لیا۔ بہادر شاہ کو گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ جہاں ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ برطانیہ کے خلاف اس شورش میں غالب نے کوئی سرگرم حصہ نہیں لیا تھا۔ اور انہیں امید تھی کہ امن و امان بحال ہونے پر ان کی پنشن دوبارہ جاری ہو جائے گی۔ لیکن بہادر شاہ کے دربار میں متعین برطانوی مخبروں کی بعض مخالفانہ رپورٹوں کی وجہ سے وہ گہرے شکوک کا مرکز بن گئے یعنی برطانوی دشمن فوجوں کا سرگرم حمایتی سمجھا گیا۔ نتیجتاً برطانیوں کے ذریعے دہلی کی دوبارہ فتح اور ہندستانی مزاحمت کے تمام اثرات کو ختم کئے جانے پر بھی غالب کی پنشن بحال نہ ہوئی۔ مئی ۱۸۶۰ء میں پنشن بحال ہونے تک انہیں اس کے لئے بہت جد و جہد کرنی پڑی۔ جولائی ۱۸۵۹ء میں نواب یوسف علی خاں والی رام پور نے اردو شاعری میں ان کا شاگرد ہونے کی پیشکش کی۔ اور اس خدمت کے لئے سو روپیہ سالانہ کا معاوضہ دینا منظور کیا۔ فروری ۱۸۶۹ء میں ان کی وفات تک یہی دونوں رقمیں ان کی کل آمدنی تھیں۔

غالب کی عظمت اس امر میں پنہاں ہے کہ انہوں نے مسلمہ ادبی روایتوں سے اپنا دامن چھڑایا۔ اردو نے فارسی شاعری سے عشق و شراب اور تصوف کے موضوعات کی روایتی علامتیں مستعار لی تھیں۔ ہماری زندگی کے حقائق سے ان کا ربط و تعلق مبہم تھا۔ اردو کے بیشتر شعرائے متقدمین فارسی زبان پر کافی دسترس رکھتے تھے اور فارسی کے ادبی معیارات سے بے حد متاثر تھے۔ اس کلیہ میں بجا میر اور نظیر ایسے مستثنیات بہت کم تھے۔ غالب نے اپنی اساس سے اپنا تعلق کبھی نہیں توڑا۔ اپنے ہندستانی ماحول کا انہیں مکمل احساس تھا۔ اور انہیں اپنے گرد جو جذبے اور محرومیاں نظر آتی تھیں وہ ان کو اپناتے تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں انسان اور اس کے مذہبی، سماجی اور ذہنی مسائل کو جگہ دی اور انہیں ایک پائندہ آفاقیت عطا کی۔

وہ ان عظیم اردو شاعروں میں سے ایک تھے جنہوں نے فلک نشین رہنے کی روایت کے خلاف بغاوت کی۔ غالب ایک ماہر صناع کی چابکدستی سے اردو شاعری کو زمین پر واپس لائے۔ ان کے قارئین کو ان کے اشعار میں اپنے دلی احساسات اور مسائل کا عکس نظر آتا تھا۔ ان کے الفاظ ہر ایک دل کی گہرائیوں میں گونج گئے۔

غالب نے جو اصلاحی تحریک شروع کی اسے آزاد اور حالی نے آگے بڑھایا۔ اور وہ اقبال کی فلسفیانہ عظمت کی شکل میں رونما ہوئی۔ آج اگر ہندستانی ادب بالعموم اور شاعری بالخصوص دیگر ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھ ملا سکتی ہے تو اس کا سہرا بنیادی طور پر غالب کے سر ہے۔

ڈاکٹر حکم چند نیّر

مرزا غالب اور سفر

مرزا غالب کو سیر و تماشہ کی ہوس نہ تھی۔ ان کی افتادِ طبع بھی کچھ ایسی ہی تھی کہ ذرا سی تکلیف بھی ان کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی تھی۔ اگرچہ وہ اپنے میں طاقت رنجِ سفر اور یارانِ وطن کی جدائی کا حوصلہ نہیں پاتے تھے لیکن کچھ توقعات کے پیشِ نظر انہیں بار بار سفر کرنا ہی پڑتا تھا۔ ان کا پہلا سفر وہ تھا جو انہوں نے عالمِ ارواح سے عالمِ آب و گل کی طرف آتے ہوئے ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو بدھ کے دن طلوعِ آفتاب سے چار گھڑی پہلے آگرے میں پورا کیا۔ ایک خط میں اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں :-

"یہ چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل
کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن
یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو
دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں
رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے لئے یہاں بھیجا گیا۔"

ان کا دوسرا سفر دہلی کی طرف تھا۔ اور یہ تیرہ سال کی عمر میں طے ہوا تھا۔ آنے اور مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد انہیں کلکتہ اور رام پور جانا پڑا۔ کلکتے کا سفر مرزا غالب کی زندگی کا سب سے لمبا سفر تھا۔ اس سفر میں انہیں فیروزپور جھرکا، بھرت پور، کانپور، لکھنؤ، باندہ، الہ آباد، بنارس، عظیم آباد اور ہگلی وغیرہ مقامات پر رکنا پڑا۔ کلکتے کا یہ سفر پنشن وغیرہ کے جھگڑوں کے سلسلے میں ہوا تھا۔ چونکہ اس زمانہ میں ریل اور موٹریں نہ تھیں اس لئے انہیں یہ سفر گھوڑا گاڑی اور کشتی کے ذریعہ کرنا پڑا تھا کانپور پہنچ کر مرزا غالب بیمار ہو گئے تھے اور ایسے بیمار کہ ان میں چلنے پھرنے کی طاقت نہ رہی۔ چونکہ کانپور میں اچھے معالج نہ تھے اس لئے بیماری کی حالت میں وہ لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں وہ پانچ مہینے زیرِ علاج رہے۔ جب یہاں بھی ان کی طبیعت بحال نہ ہوئی تو وہ باندہ کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ اور جوں توں کر کے باندہ پہنچ گئے۔ یہاں خدا کے کرم اور نواب ذوالفقار علی بہادر کی تیمارداری اور حکیموں سے انہیں بیماری سے نجات مل گئی۔ مقام باندہ کی یادگار وہ اردو غزلیں ہیں جو حافظ محمود شیرانی والے نسخے پر درج ملی ہیں۔ باندہ سے روانہ ہوئے تو الہ آباد ہوتے ہوئے بنارس پہنچے۔ بنارس میں یقیناً موسمِ برسات کے بعد آئے تھے۔ اور آموں کا موسم گزر چکا تھا۔ ورنہ مرزا غالب جیسے آموں کے رسیا بنارس کے بانکے رسیلے لنگڑے آم کا ذکر ضرور کرتے۔ بہرحال بنارس آنے کے بعد اس جنتِ ارضی کی رنگین فضا، حسن پرور آب و ہوا اور عشق خیز نظاروں کی سیر سے ان کی طبیعت بہت جلد بحال ہوگئی۔ اور سب سے بڑی بات یارانِ وطن کے سوا انہیں کوئی غم نہ تھا۔ ۱۸ دسمبر ۱۸۲۷ء کو وہ کشتی میں سوار ہوئے اور عظیم آباد ہگلی ہوتے ہوئے ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے۔ کلکتے میں انہیں اپنے مقدمہ کی پیروی کرنی تھی۔ لیکن مقدمہ جلدی فیصل ہوتا نظر آیا۔ تو وہ منشی غفراللہ کو اپنا وکیل مقرر کرکے دہلی کے لئے روانہ ہوئے۔ اور تقریباً تین برس باہر رہ کر ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو دہلی پہنچ گئے۔ اس سفر میں الہ آباد اور کلکتے میں ناخوشگوار واقعات پیش آئے۔ جن کی تلخی کو وہ زندگی بھر نہیں بھولے۔ مرزا غالب کے اس سفر کی یادگار ادبی تخلیقات میں متعدد اردو غزلیں، فارسی تصنیف کے علاوہ دو فارسی مثنویاں ہیں۔ ایک مثنوی چراغِ دیر ہے جو بنارس کی تعریف میں ہے۔ اور بنارس میں ہی لکھی گئی تھی۔ دوسری مثنوی کلکتے کے ادبی معرکے کی یادگار ہے۔ اس کا پہلا نام آشتی نامہ تھا لیکن کلیات میں بادِ مخالف کے نام سے چھپی۔

مرزا غالب کا چوتھا سفر رام پور کا سفر تھا۔ نواب یوسف علی خاں

نواب رام پور سے ان کے پرانے تعلقات تھے۔ ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق خیرآبادی کی بدولت ان تعلقات کی تجدید ہوئی۔ اور نواب صاحب نے سبق کچھ اشعار مرزا غالب کے پاس برائے اصلاح بھیجے۔ نواب صاحب نے انہیں رام پور آنے کی کئی بار دعوت دی۔ لیکن وہ جنوری ۱۸۶۰ء سے پہلے رام پور نہ جا سکے۔ مرزا غالب جب رام پور پہنچے تو ان کی اچھی طرح پذیرائی ہوئی۔ خاص کوٹھی قیام کے لئے ملی۔ لیکن بچوں کی وجہ سے وہ اس کوٹھی کو چھوڑ کر محلہ راجا دروازہ کے ایک شاہی مکان میں جا رہے۔ مرزا صاحب گرمی اور برسات کا موسم یہاں گذارنا چاہتے تھے لیکن عارف مرحوم کے صاحبزادوں نے دہلی چلنے کی رٹ لگا دی۔ اس لئے نواب صاحب سے اجازت لیکر ۱۸ مارچ ۱۸۶۰ء کو دہلی آ گئے۔

رام پور کا دوسرا سفر ۱۸۶۵ء میں پیش آیا۔ اس سفر کی غرض نواب محمد یوسف علی خاں مرحوم کی تعزیت اور نواب کلب علی خان کے جشنِ مسند نشینی کی تہنیت تھی۔ مرزا غالب ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو رام پور پہنچے۔ نواب صاحب تعظیم و تکریم اور محبت سے پیش آئے۔ اس بار ان کا قیام جرنیلی کوٹھی میں تھا۔ تقریباً دو مہینے رہ کر وہ ۸ دسمبر کو دہلی کیلئے روانہ ہوئے۔ رام گنگا میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ ان کی پالکی اس پار پہنچی کہ پانی کے ایک زوردار ریلے میں پل بہہ گیا۔ مرزا صاحب کے ملازم تمام اسباب اور [illegible] سمیت اس پار کھڑے رہ گئے۔ بہرحال بے سر و سامانی کی حالت میں گرتے پڑتے مرادآباد پہنچے۔ اندھیر کے حادثوں کی یاد جیسی لمبی رات سرائے میں مرزا نے کسمپرسی میں گزارنا پڑی۔ اگلی صبح مولوی محمد حسن خاں صدر الصدور مرادآباد کو خبر ملی۔ تو انہیں اپنے یہاں لے گئے۔ مرادآباد میں ان کی ملاقات نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ہوئی۔ شیفتہ نے رام پور جا کر نواب صاحب کو اس حادثہ کی اطلاع دی تو نواب صاحب نے اپنا خاص آدمی بھیج کر مرزا صاحب کو رام پور بلانے کے لئے لکھا۔ لیکن نواب صاحب کے آدمیوں کے مرادآباد پہنچنے سے قبل وہ دہلی کے لئے روانہ ہو چکے تھے۔

مرزا صاحب کا یہ سفر کامیاب ترین سفر تھا۔ نواب صاحب نے انہیں ایک ہزار روپے بتقریب تخت نشینی اور دو سو روپے بطور زادِ راہ عنایت فرمائے۔ لیکن مرزا غالب اس سے زیادہ کی آس لگائے ہوئے تھے۔ کیونکہ اس زمانے میں وہ کافی مقروض تھے۔ اور اس سے ان کی پیاس نہ بجھ سکی۔ ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں۔

لو صاحب کچھ کو کمائی دن بچا کے
کپڑے چاڑے گھر کو آئے۔
۸ جنوری ماہ و سال دو شنبہ کے دن
غالب ابھی کی طرح اپنے گھر پہنچ گئے

(بشکریہ اردو پروگرام آل انڈیا ریڈیو دہلی)

خواجہ احمد عباس

غالب ایک انسان ایک شاعر

اس سال غالب کا صد سالہ جشن منایا جا رہا ہے ۔ جس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ جو شخص اپنی گمنامی اور کسمپرسی کے عالم میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا ۔ ایک سو سال بعد اس کا جشن منانے کا خیال لوگوں کے دماغ میں آیا ہے ۔

لوگ کہتے ہیں کہ غالب ایک پیغمبر تھا اور یہ کون نہیں جانتا کہ ایسے لوگوں کی قدر ان کی اپنی زندگی میں نہیں ہوتی اور ہر شاعر اسے تو اس کی موت کے بعد ہی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے ۔ ایران کے کلاسیکی شاعر فردوسی کی حقیقت سے کون واقف نہیں جسے شاہِ وقت نے ہر شعر کے لئے سونے کی ایک مہر دینے کا وعدہ کیا تھا ۔ اور جب شاہ نامہ مکمل ہو گیا تو اسے چاندی کے سکے دئے جانے لگے ۔ جسے خود فردوسی نے لینے سے انکار کر دیا ۔ روایت ہے کہ جس وقت فردوسی کا جنازہ لیجایا جا رہا تھا اس وقت سونے کی مہروں سے بورے لدے ہوئے اس کی خدمت میں حاضر کرنے کے لئے جا رہے تھے ۔

یہ ستم ظریفی ہے لیکن اس سے شاعر کی زبوں حالی کا پتہ چل جاتا ہے ۔ غالب صد سالہ جشن ہندوستان اور دوسرے ممالک میں وسیع پیمانے پر منایا جا رہا ہے ۔ اور اس ضمن میں لاکھوں روپے خرچ کئے جا رہے ہیں ۔ خود دہلی میں غالب میموریل اور غالب اکیڈمی کی عمارتیں تعمیر کی جا چکی ہیں ۔ لیکن جس مکان میں غالب نے خستہ حالی کے دن بسر کئے اور جہاں اس نے موت کو لبیک کہا وہ مکان اب بھی خستہ حالی کی داستان بیان کر رہا ہے ۔ ہندوستان کی حکومت نے اس سلسلہ میں کتنی خوب بات کہی ہے کہ انہوں نے شاعر کو جیتے جی کچھ نہ دیا ۔ اور مجھے اب اس بات پر حیرانی ہوتی ہے کہ وہ اس کا ۳۲ لاکھ روپے خریدنے کے لئے دعوا دعوا کر رہے ہیں ۔

قلم اور تلوار

اسد اللہ خان غالب ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوا جس کا آبائی پیشہ سپاہ گری تھا ۔ غالب نے اپنے اجداد کی فوجی روایات کا حوالہ بھی دیا ہے ۔

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

غالب نے ایک ایسے سکول سے تحصیل علم کیا جہاں ذریعہ تعلیم فارسی تھا ۔ بس کلاسیکی فارسی شعرا کا سحر ان پر چلا اور انہوں نے قلم پکڑ لیا ۔ انہوں نے چھوٹی عمر سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا ۔ شروع شروع میں تو فارسی ان کی توجہ کا مرکز رہی لیکن جیسے جیسے اردو کو فروغ ہونے لگا وہ اردو میں بھی شعر کہنے لگے ۔ ان کے ایک ہی خواجہ کو لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا جہاں انہوں نے غالب کی چند غزلیں میر کو دکھائیں ۔ غالب اس وقت ۱۲ سال کے تھے ۔ اور میر نے ان کے تابناک مستقبل کی پیشگوئی کی تھی مگر افسوس کہ میر جلد ہی وفات پا گئے ۔ اور وہ نوعمر غالب کی رہنمائی نہ کر سکے ۔

نئی زبان کا شاعر

دوسرے اردو شاعروں کے برعکس غالب نے کسی استاد سے اصلاح نہیں لی ۔ بعد کے برسوں میں وہ شاعری کو خدائی عطیہ کہتے تھے ۔ اردو اور غالب کا ایک دوسرے پر گہرا اثر تھا ۔ نئی زبان جو بازاروں ، فوجی کیمپوں اور دوسرے مقامات پر پنپ رہی تھی ، اسے عام لوگوں تک اپنے دل کی بات کہنے کیلئے کوئی ذریعہ درکار تھا ۔ اور غالب نے یہ کام کر دکھایا ۔ وہ زبان تھی جو جاندار تھی ۔ خوبصورت تھی ۔ لچکدار تھی ۔ اور جس کو شاعر اپنی ضرورت کے مطابق ڈھال سکتا تھا ۔ غالب صرف زبان کے معمار ہی نہیں تھے ۔ نقد کے ارتقاء میں ان کے رول کو شیکسپیئر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے ۔

جدید فکر کی چھاپ

ایک اعتبار سے غالب اردو ادب میں جدید اسلوب کا بانی تھا ۔ ان کے عہد تک شاعر اپنے تصور میں غرق رہتا تھا ۔ اور صوفیانہ نغمے الاپتا رہتا تھا ۔ چونکہ جاگیردارانہ نظام کا وجود دوررہ تھا اس لئے شاعری انسانی جذبات و تجربات کا کوئی ذریعہ نہیں تھی ۔ غالب نے اس سلسلہ میں نئی راہیں ہموار کیں ۔ کیونکہ وہ مغربی فکر اور انگریزی ادب سے کافی حد تک روشناس تھے ۔ خود لالہ مالک رام جی نے بھی بہترین الفاظ میں شاعر اعظم کو خراج عقیدت پیش کیا ہے ۔

درد و کرب

لیکن غالب کی شاعری پر مغربی فکر سے زیادہ خود ان کے اپنے تجربات ان کے اپنے درد و کرب نے ان کی اپنی غربت و افلاس نے ان کی اپنی سماجی اور سیاسی الجھنوں نے انہیں ایک نئی زبان بخشی ۔

ہم ہندوستانیوں کی عادت سی ہے کہ ہم بڑی بڑی ادبی ہستیوں کو دیوتا بنا کر رکھ دیتے ہیں ۔ یا انہیں مافوق الفطرت کی شکل میں پیش کرتے ہیں ۔ ہم اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ وہ دراصل ہماری مانند انسان تھے ۔ اور ان کا بھی وہ انسانی جذبہ تھا جس نے ان کی شاعرانہ حس کو تقویت دی ۔

یہی شخصی درد و کرب ہی ہوتا ہے جو کندن بن کر نکلتا ہے اور ایک عالم کو مسحور کر دیتا ہے ۔

غالب کو زندگی میں دکھ اور درد بہت زیادہ ملا ۔ کتاب چھپنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا ۔ اور ادب سے زندگی کی بسر اوقات ممکن نہیں تھی ۔ شعرا ادبا اور مصنفین کو بادشاہوں کی سرپرستی حاصل کرنا پڑتی تھی ۔ تاکہ دربار شاہی کے صدقے ان کے پیٹ کا مسئلہ حل ہوتا رہے ۔ اور وہ مقابلتاً بہتر زندگی بسر کر سکیں ۔

غالب آگرہ میں ایک پڑھے لکھے خاندان میں پیدا ہوئے اور ان کی شادی ایک رئیس اور کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی سے ہوئی ۔ جو دہلی میں مقیم تھی ۔ کچھ مدت تک غالب اپنے سسرال میں رہے ۔ اور ان کے طفیل سے انہیں عالموں فاضلوں ، شاعروں اور ادیبوں سے روشناس ہونے اور دوستی کرنے کا موقع ملا ۔ یہی وہ لوگ تھے جن کو غالب کی بعد کی زندگی میں اہم پارٹ ادا کرنا تھا ۔ لیکن غالب بڑے شائستہ اور خوددار قسم کے انسان تھے ۔ لہذا وہ جلد ہی اپنے مکان میں چلے آئے ۔ جہاں انہیں اپنی زبوں حالی کا کھل کر سامنا کرنا پڑا ۔ انہیں پنشن کے ساڑھے سات سو روپے سالانہ ملتے تھے ۔ اور یہی ان کی مستقل آمدنی تھی ۔ اس پر یہ کہ اس رقم میں سے بعض اوقات کٹوتی ہو جایا کرتی تھی ۔

جواری اور عاشق

غالب ہمیشہ ہی قرض میں جکڑے رہتے تھے وہ شطرنج اور چوسر کے شوقین و عادی تھے ۔ اور اس پر چھوٹی موٹی رقم لگا کر کھیلا کرتے تھے ۔ غالباً ان کی معاشی بدحالی ہی نے انہیں جواری بننے کی تحریک دی ۔ لہذا ان کا غریب خانہ بڑے بڑے امیروں کے لئے جوئے کا اڈہ بن گیا ۔ شہر کوتوال غالب کا دوست اور شفیق تھا ۔ لیکن اس کے تبادلے کے بعد کسی دوسرے شخص نے چارج سنبھال لیا ۔ اس نے چھاپہ مارا اور سب لوگوں کو بشمول غالب گرفتار کر لیا ۔ امیر جوئے باز تو یہاں رشوت دے کر بھاگ نکلے ۔ وہاں غریب غالب کو چھ ماہ قید بامشقت کی سزا ہوئی ۔ غالب صرف تین ماہ جیل میں رہے ۔ لیکن اس دوران میں انہوں نے ایک طویل نظم تیار کر ڈالی ۔ جو ان کی حالتِ زار کی صحیح ترجمانی ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ نوعمری میں غالب کو کسی سے عشق ہو گیا تھا ۔ وہ غالباً گانے والی کوئی لڑکی تھی ۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں کیونکہ شاعروں کے لئے ایسا ہو ہی جاتا ہے ۔ لیکن اُن کے شعروں کی گہرائی میں جایا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ عشق اُن کے دل و دماغ تک اثر کر چکا تھا ۔ اور وہ لڑکی نے نوعمری ہی میں خودکشی کر لی ۔ غالب کی شاعری پر اس واقعہ کا بھی گہرا اثر پڑا ۔ اور ان کی شاعری میں سوز پیدا ہو گیا ۔

تضاد

غالب کی زندگی اور ان کے کردار کے متعلق بہت بڑا تضاد ہے ۔ جس سے ان کی قدر و منزلت بڑھ گئی ہے ۔ وہ ایک عابد زاہد تھے ۔ لیکن عشق پر تو کسی کا زور نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی اور لڑکی کو بھی دل دے بیٹھے ۔

وہ ہمیشہ مفلس مگر بے حد حساس رہے ۔ لیکن ان کی خودداری پر کوئی حرف نہ آ سکا ۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار ایک انگریز گورنر

لے انہیں بلا بھیجا - تاکہ ان کی نوکری کا مسئلہ حل کیا جا سکے - غالب پالکی میں بیٹھ کر وہاں گئے - لیکن وہ پالکی سے باہر نہیں نکلے کیونکہ انگریز گورنر انہیں لینے کے لئے باہر نہیں آیا تھا - انہیں نوکری سے ہاتھ تو دھونا ہی پڑے لیکن وہ اس کے لئے اپنی خودداری کو ترک نہیں کر سکتے تھے - وہ کافر تو نہیں تھے لیکن کٹر مذہبی بھی نہیں تھے - ان کی شاعری میں انسانیت نوازی کا عنصر ملتا ہے - جسے کو مذہب کی تنگ حدود میں پیش نہیں کیا جا سکتا -

جاگیردارانہ نظام کے سبھی دوسرے شعرا کی مانند غالب بھی قصیدہ گو شاعر تھے - لیکن وہ اپنی خودداری کا بہت دھیان رکھتے تھے - اور اسے کسی قیمت پر قربان کرنے کو تیار نہیں ہوتے تھے - اس سلسلہ میں کتنی ہی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں - انگریز گورنر کا قصہ تو بتایا ہی جا چکا ہے -

۱۸۵۷ء کے انقلابی حالات و واقعات نے ان کی زندگی میں سب سے زیادہ دباؤ اور کھچاؤ فراہم کیا - وہ پہلے درجے کے دانش مند تھے - اور بہادر شاہ ظفر کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے - ان کی شاعری میں ایسے شعر کی کمی نہیں جو وقت کے حالات کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں - اور انہیں ایک محب وطن کے روپ میں پیش کرتے ہیں - لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب بغاوت کو دبا دیا گیا تو وہ اپنی پنشن کی تجدید کے لئے کوشش کر رہے تھے - جسے محض اس وجہ سے بند کر دیا گیا کہ غالب کو باغیوں سے ہمدردی تھی -

ہمہ گیر شاعر

انہوں نے بادشاہوں اور والیوں کے قصیدے بھی لکھے - لیکن ایسے دور میں جب انسان میں کہ خود ان کی اپنی زندگی حالی کی منہ بولتی تصویریں تھیں انہوں نے اندرونی جذبات و کرب کا جسے خوبصورت اور رقت انگیز پیرائے میں ذکر کیا ہے - یہی وجہ ہے کہ ایک سو سال بعد بھی ان کی شاعری اسی طرح زندہ جاوید ہے - یہی وہ امتیاز ہے جس نے ان کی شاعری کو جلا بخشی ہے اور ہر قماش ہر دور کا انسان اسے پسند کرتا ہے -

غالب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں -

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم - ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یہ لاش بے کفن اسد خستہ جاں کی ہے - حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ہے کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے - شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

PROPOSED GHALIB MEMORIAL AT NEW DELHI

دہلی میں تعمیر کی جانے والی مجوزہ غالب میموریل بلڈنگ کا ایک خاکہ

مرزا غالب کے قدردان اور سرپرست - نواب کلب علی خاں
والئ رامپور جنہوں نے غالب کا تاحیات وظیفہ مقرر کیا -

شہنشاہ بہادر شاہ ظفر
جو مرزا غالب کے سرپرست بھی تھے اور شاگرد بھی -

مرزا غالب کی مہر

مرزا غالب کے لکھے ہوئے ایک خط کا عکس

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم و نیاز معروض ہے جب سے حضرت کی ناسازیٔ مزاج مبارک کا حال خارج سے
مسموع ہوا ہے عالم الغیب گواہ ہے کہ مجھ پر اور میرے بال بچوں اور میرے فرزند حسین علی خاں پر
کیا گزر رہی ہے ایک دن رات میرے گھر میں روٹی نہیں پکی ہم سب نے فاقہ کیا بارے وہ خبر
وحشت اثر غلط نکلی جو اس تہلکے ہوتے ہوئے بالکل اطمینان جب ہوگا کہ آپ کے
غسل صحت کی نوید سنوں گا اور قطعہ تاریخ غسل صحت لکھ کر بھیجوں گا فی الحال
اتنا چاہتا ہوں کہ اس خط کا جواب پاؤں اور حقیقت مرض سے آگہی حاصل ہو
زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ڈاکٹر رضا آصل اوتاڈ

مرزا غالب زندگی کے نقیب

مرزا غالب کے دور کو اگر دورِ گردش کہہ لیا جائے تو بیجا ہوگا ۔ پریشانیوں اور ادائیوں سے گھرا ہوا دور ۔ مایوسیوں اور نامرادیوں کا عہد ..... یہ وہ زمانہ تھا جبکہ چاروں طرف بیکسی اور بے بسی چھائی ہوئی تھی ۔ دہلی انگریز کے ہاتھوں لٹ چکی تھی ۔ لال قلعہ کے وسیع محل جن میں کبھی غالب کی غزلیں تاجدارِ مغلیہ سلطنت کیلئے سامانِ راحت پیدا کرتی تھیں اب ایک عجیب کا منظر بنے بیٹھے تھے بہادر شاہ ظفر گرفتار ہو کر رنگون جا چکے ..... مرزا بے سہارا ہو گئے ۔ بے یار و مددگار ہو گئے یہ ایک ایسا المیہ تھا جو غالب صاحب کے لئے تقاضائے ناگہانی سے کم نہ تھا ۔ دربار کی پنشن بند ہو گئی ۔ جب دربار والے ہی نہ رہے تو پنشن کہاں سے ملتی ۔ شب و روز جام و مینا لنڈھانے والا غالب بوند بوند کو ترس گیا ۔ احباب و رفیق جو دن رات دروازوں سے نہ اٹھتے تھے ان کی شکلیں دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں ۔ اس اندوہگیں ماحول میں مرزا جیسے نازک طبع شاعر کا مسکرانا اور زمانے پر پھبتیاں کسنا ایک حیرتناک معجزہ سے کم نہیں ۔

مرزا غالب کی طبیعت ہمیشہ کی طرح چہکتی رہی ، انکی شاعری چہکتی رہی اور اردو ادب کے لئے موتی لٹاتی رہی وہ زمانے کی نیرنگیوں سے گھبرائے نہیں بلکہ ایک سنجیدہ مفکر کی طرح مسکراتے ہوئے مصائب و طوفان کا مقابلہ کرتے رہے انہوں نے ستم ہائے روزگار کا شکوہ تک نہیں کیا ، بلکہ جو بھی آشنا ان سے گردشِ ایام کا شکوہ لیکر آتے وہ انکو سمجھاتے رہے کہ بھئی صاحب میں تو بالکل ٹھیک ہوں .....

ان کی چشمِ بینا دنیا کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ تھی وہ خود کہتے ہیں ۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ میرے آگے

گویا کہ شور و غل اور ہاؤ ہو کچھ بھی نہیں محض بچوں کا کھیل ہے مرزا حالات کی سختیوں سے قطعاً بے نیاز ہیں ۔

غالب کے ہاں اگر غم ہے بھی تو ایک دم بھر سے زیادہ نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب اپنے شکوہ کی لو کو برقِ تپاں سے روشن کرتے ہیں ۔ جیسے برق کی چمک پل بھر سے زیادہ نہیں ہوتی اسی طرح غالب کے غم کی میعاد بھی زیادہ نہیں وہ محرومیٔ مسرت کا افسوس نہیں کرتے ۔ ان کی نظر میں عیش و نشاط کی کیفیت سدا نہیں کیونکہ کبھی کبھی گردشِ ایام کا خوف خوشی کی حالت میں بھی لگا رہتا ہے ۔ اور فطرتِ انسانی فطرت ہے کہ خوشی کے بعد سخت انتہائی تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے جیسا کہ غالب لکھتے ہیں ۔

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیٔ جاوید نہیں

وہ تو عزیزوں دوستوں کو سمجھاتے ہیں کہ زمانے سے شکوہ کیسا؟ بے وفا یاروں سے گلا کیوں ؟ کیا ہوا اگر ماحول آج موافق نہیں کل پھر ہماری ہوگی ۔ غالب جہد جہد کے قائل ہیں انکے ہاں بڑی سے بڑی تکلیف بھی ایک تماشہ کی حیثیت رکھتی ہے ۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ غالب متحمل تھے ان پر گردشِ افلاک کا اثر ہی نہیں ان سے ناچار ہو بھی سمجھی جا سکتی ہے لیکن جذبۂ احساس سے عاری نہیں کہا جا سکتا ان کا یہ شعر ان کے کیفیتِ دل کا شاہد ہے ۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

ان کا دل ابھی زمانہ کی ستم ظریفیوں سے نالاں ہے۔ ان کی آنکھوں سے ابھی پرانی محفلوں کی یادیں آنسو بنکر نکلتی ہیں۔ لیکن وہ کھل کر رو نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے رونے سے ایک ہیجان بپا ہو جائیگا۔ کہرام بچ جائیگا۔ جس کا اثر ان کے دوستوں پر پڑے گا۔ غالب خود تو تکلیف سہہ لیں گے مگر دوستوں کا دکھ نہ برداشت ہوگا ؎

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

یہی شعر ان کے دل کی کیفیت کو عیاں کرتا ہے۔ غالب ساری عمر مالی پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ قرض نہیں چکا سکے۔ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ عارف کو گود لیا لیکن وہ بھی عین عالم شباب میں چل بسا۔ عارف کی موت نے غالب کی نیندیں اڑا دیں۔ دلی کے اجڑنے کا غم علیحدہ۔ ذریعہ معاش شاہ ظفر تھے وہ بھی آسرا نہ رہا۔ گویا کہ مرزا غالب کو چاروں اطراف سے غم کی آگ نے جلا رکھا ہے۔ لیکن دیکھئے مرزا ان مصائب و طوفان میں بھی مسکراتے نظر آرہے ہیں۔ اُف خدا سے چھیڑ چھاڑ کر رہے ہیں ؎

زندگی اپنی جب اس شکل میں گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھیں۔

غالب کی شاعری محض رنگینیٔ طبع کی حاجت ہی پوری نہیں کرتی اس میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ حیات نو کا پیغام ہے۔ زندہ دلی کے اشارے ہیں۔ مسکراتے ہوئے جذبات ہیں۔ اداس دلوں کے لئے پیغام راحت ہے۔ شعر پڑھتے جایئے اور جھومتے جایئے بس یہ سمجھ لیجئے کہ جیل خوشی تو الغرض بیچ ہے۔ دو دہائی کی آمد ہے۔ غالب ایک عظیم فلسفی تھے۔ جنہوں نے زندگی کا حقیقی معنوں میں احساس کیا وہ زندگی سے لا انتہا پیار کرتے تھے۔ وہ اپنی موت کے جلدی آنے سے ڈرتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ کچھ دن اور یہاں رہ کر نظارہ جہاں کریں۔

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

وہ موت سے التجا کر رہے ہیں کہ تو اتنی جلدی آگئی ابھی تو خون جگر آنکھ سے آنسو بن کر نہیں ٹپکا۔ مجھے تھوڑی دیر کے لئے اور اس دُنیا میں رہنے دے کیونکہ مجھے یہاں ابھی بہت کام کرنے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مرزا غالب کو اس جہاں سے کتنی محبت ہے۔ ان کے پہلو میں زندگی کے لئے کتنا درد ہے۔ غالب افسردہ اور مایوس انسان کو جو زندگی کی تلخیوں سے گھبرا کر اداس ہوگیا ہے تلقین کرتے ہیں کہ ہمیں غم نہیں کرنا چاہئے کیونکہ جب تک انسان کی زندگی ہے غم ضرور ساتھ چلے گا۔ اس سے نجات ناممکن ہے۔ ہاں غم کا خاتمہ ہماری موت پر ہی ہو سکتا ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مرزا صاحب زندگی کے نقیب تھے جن کی مدح پرور شاعری نے ہماری زندگی کو پرلطف بنا دیا ورنہ یہ حقیقت ہے کہ اس ناپائیدار دُنیا میں دل کو آرام کہاں؟ سو سال بیت جانے پر بھی غالب کی شاعری میں وہی بانکپن ہے۔ اس سائنسی دور میں جبکہ انسان آسمان کی بلندیوں کو چھو رہا ہے اس کے ذہنی انتشار کو دور کرنے کیلئے غالب کی غزل روح افزا ہے اس میں شک نہیں کہ دور جدید کے شعراء نے زندگی کی نشو و نما میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ مگر جو سرور مرزا کی شاعری میں ہے وہ دوسروں میں کہاں ؎

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

حق بات کی خاطر اُٹھانا حق بات کی خاطر کٹ مرنا
یہ کام جنوں کر سکتا ہے یہ عقل کے بس کی بات نہیں
صابر ابوہری

محمد معز الدین معظم

مرزا اسد اللہ خاں غالب

نام مرزا اسد اللہ خاں غالب عرفیت مرزا نوشہ تھی تخلص ابتدا میں اسد تھا۔ ۱۲۴۳ھ م ۱۸۲۸ء میں غالب تخلص اختیار کیا جن غزلوں میں اسد تخلص تھا انہیں دنیا ہی رکھ چھوڑا۔ اکثر لوگ انہیں نصیری بھی کہتے ہیں۔ اور مرزا اس کو خوش ہوتے۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں ؎

منصور فرقۂ علی اللّٰہیان منم
آوازہ اَنا اسد اللہ بر افگنم

تمام اقربا اور حقیقی دوست اہل سنت الجماعت تھے لیکن ابتدا میں کسی طرح کی تبدیلی نہ معلوم ہوتی تھی۔ مولانا فخر الدین کے خاندان کے مرید تھے۔ دربار اور اہل دربار میں کبھی اس معاملہ کو نہیں کھولتے تھے اور یہ طریقہ دہلی کے اکثر خاندانوں کا تھا۔ آپ کے دادا اپنا وطن سمرقند چھوڑ کر ہندوستان آئے اور شاہ عالم ثانی کی ملازمت اختیار کی۔ مرزا کے والد عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولہا نے آگرہ کے ایک مشہور خاندان میں شادی کی۔ مرزا اسد اللہ خاں بمقام آگرہ ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ شاہ عالم کے دور میں طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم ہوا۔ مرزا کے والد عبداللہ بیگ خاں لکھنؤ جاکر نواب آصف الدولہ کی ملازمت اختیار کی وہاں پر بھی کسی لڑائی میں مارے گئے۔ والد کے انتقال کے وقت مرزا کی عمر ۵ سال کی تھی۔ مرزا نصر اللہ بیگ خاں صوبیدار جو مرزا کے حقیقی چچا تھے ان کے زیر سایہ مرزا نے اپنے چھوٹے بھائی یوسف خاں کے ساتھ اپنی ابتدائی عمر بسر کی۔ اس زمانے میں آگرہ کے مشہور معلم جناب شیخ معظم سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک پارسی معلم عبدالصمد دو برس تک مرزا کے معلم رہے۔ مرزا نے فارسی میں کافی مہارت حاصل کرلی۔ مرزا اپنے چچا کے ہمراہ دہلی چلے گئے۔ وہاں پر کچھ دنوں بعد چچا کا انتقال ہوا۔

نواب الٰہی بخش خاں معروف کی لڑکی سے آپ کا نکاح ہوا۔ اس وقت مرزا کی عمر ۱۳ برس تھی۔ اس نسبت کی وجہ سے دلی کو آپ کی آمد و رفت زیادہ ہوگئی۔ اور آخری عمر تک دلی ہی میں مقیم رہے ۱۸۲۸ء میں آپ اپنی ذاتی پنشن کا تصفیہ کرانے کلکتہ گئے اس دوران آپ کو لکھنؤ، بنارس میں بھی قیام کرنے کا اتفاق ہوا۔ ان مقامات پر مرزا کی کافی شہرت ہوئی۔ نواب واجد علی شاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا تو نواب صاحب نے سالانہ پانچ سو روپیہ وظیفہ مقرر کیا۔ ۱۸۵۰ء میں ابو مظفر سراج الدین بہادر شاہ نے آپ کو نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب بخشا۔ اور خاندان تیموری کی تاریخ نویسی کیلئے پچاس روپیہ ماہوار مقرر ہوئے ۱۸۵۴ء میں استاد ذوق کا انتقال ہوا تو مرزا بادشاہ کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد کے دوران مرزا گھر کے باہر نہ نکلے۔ گوشہ تنہائی میں رہ کر حالات کا جائزہ لیتے رہے چھوٹے بھائی یوسف خاں نے اس زمانہ میں ۳۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس کے بعد مرزا کی سرکاری پنشن بند ہوگئی قریب دو برس مرزا تنگدستی کا شکار رہے۔ جب دہلی شاہ ہوگئی تو مرزا رامپور گئے۔ نواب صاحب رامپور سے ۳۰-۴۰ برس کا تعارف تھا۔ نواب صاحب ۱۸۵۷ء میں مرزا کے شاگرد بھی ہوئے تھے۔ اور ناظم تخلص تھا۔ ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا چند روز ابھی گزرے۔ مرزا کو دہلی کے بغیر چین کہاں۔ چند روز بعد واپس دہلی ہوئے۔ کچھ دنوں بعد سرکاری پنشن وغیرہ جاری ہوگئی۔ آخر عمر میں بڑھاپے نے بہت ہی عاجز کر دیا تھا۔ کانوں سے سنائی نہ دیتا تھا۔ نقش تصویر کی طرح بیٹھے رہتے تھے کسی کو کچھ کہنا ہوتا تو لکھ کر دیتا مرزا دیکھ کر جواب دے دیتے۔ چنانچہ دو تین برس پہلے یہ دہ گئی تھی صبح کو داغ سخت بادام کا شیرہ دیتے آپ

گوشت۔ شام کو چار کباب تلے ہوئے۔ آخر ۷۳ برس کی عمر ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ چند روز پہلے یہ شعر اکثر پڑھتے تھے

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

اس میں شک نہیں کہ مرزا اپنے عہد میں فارسی کے یگانۂ عصر تھے۔ مگر علوم درسی کی تحصیل طالب علمانہ طور سے نہیں کی۔ جو کچھ حاصل کیا اپنے طبعی اور فطری ذوق سے حاصل کیا۔ اور پھر اسے درجۂ کمال پر پہنچایا۔ مرزا نے ایک فکر میں نیا انداز لفظوں میں نئی تراش اور ترکیب میں انوکھی روش پیدا کی۔ خود ان کا قول ہے کہ فارسی زبان سے مجھے مناسبت ازلی ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ میری طبیعت کو اس زبان سے ایک قدرتی لگاؤ ہے۔ منشی میر صاحب کو قاطع برہان بھیجتے ہوئے جو خط لکھا تھا اس میں فرماتے ہیں۔ دیباچہ اور خاتمہ میں جو کچھ لکھ آیا ہوں وہ سب سچ ہے۔ کلام کی حقیقت کی داد چاہتا ہوں۔ نگارش لطافت سے خالی نہ ہوگی۔ علم و ہنر سے عاری ہوں۔ لیکن ۵۵ برس سے جو سخن گذاری میں لگا ہوں فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ مناسبت ازلی اور سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہل پارس کے منطق کا مزہ بھی ابدی لایا ہوں۔

مرزا کے بھلے چنگے دل اور کھلے ہوئے ہاتھ نے ہمیشہ مرزا کو تنگدست رکھا مگر اس تنگدستی میں بھی امارت کے ٹھٹے قائم تھے۔ چنانچہ اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر خطوط سے یہ حال آئینہ ہے۔ مرزا اپنے شاگرد کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

ایک سو روپیہ ہنڈی وصول کرلی۔ ۴۴ روپیہ داروغہ کی معرفت آئے تھے۔ وہ واپس دے دیے۔ ۵۰ روپیہ محل کو دے دیے۔ ۶ روپیہ باقی بچے وہ بکس میں رکھ دیے۔ کہاں سودا سلف بازار گیا ہے۔ جلد آ گیا تو آج ورنہ کل یہ خط ڈاک میں بھیج دونگا۔ ملازم کو بتیا دیکھے۔ اور اگر دے بھائی میری آبرو ہے۔ انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ قصہ مختصر تمام ہوا۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

ہنڈی ۲۰ دن کی میعاد تھی۔ ۹ دن گذر گئے ۱۱ دن باقی تھے مجھ کو صبر کہاں۔ میں کاٹ کر روپیہ لے لئے۔ قرض متفرق سب ادا ہوا۔ مہاجن سبکدوش ہوگیا۔ آج میرے پاس نقد بکس میں ہیں۔ اس کے علاوہ چار بوتل شراب کی اور تین شیشے گلاب کے توشے خانے میں موجود ہیں۔

غالب ایک اور جگہ اپنی بیماری کا حال لکھتے ہیں۔

ضعف سے گر چہ دیوان خانہ کے بیچ
قریب ہے کہ کیا امکاں جو چل بھی سکوں

صبح کو دو بجے کھانا یہیں آ جاتا ہے۔ پلنگ سے نہیں پڑا۔ ہاتھ منہ دھو کر کھانا پھر ہاتھ دھوئے۔ کوئی پلنگ پر جا پڑا۔

ایک شاگرد سے بے تکلفی تھی۔ اس نے امراؤ سنگھ نام کے ایک اور شاگرد کی بی بی کا حال مرزا کو لکھا اور یہ بھی لکھا کہ ننھے ننھے بچے ہیں اب اور شادی نہ کرے تو کیا کرے۔ پھر بچے کون پالے۔ اس شخص کی ایک پہلی بی بی مر چکی تھی۔ یہ دوسری بی بی تھی۔ اب مرزا اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں۔

امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ٹوٹتا ہے نہ دم نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لونگا کیوں بلا میں پھنستا ہے۔

جب ان کی پنشن کھلی تو ایک شخص کو لکھتے ہیں تجھ کو میری جان کی قسم اگر میں تنہا ہوتا تو اس وجہ قلیل میں کیسا فارغ البال خوشحال ہوتا۔۔۔۔ مرزا نے پاک خیالات اور اعلیٰ مضامین کا گنج بائے گرانمایہ اپنی یادگار کے طور پر چھوڑا ہے۔ تاہم اولاد کے معاملے میں وہ بدنصیب ہی رہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ سات بچے ہوئے مگر پندرہ پندرہ مہینے کے بس دنیا میں سب ملک عدم کو چلے گئے۔ بیوی کے بھانجے الٰہی بخش خاں مرحوم کے بیٹے زین العابدین خاں تھے۔ وہ بھی شعر کہا کرتے تھے۔ اور عارف تخلص کیا کرتے تھے۔ عارف جوان مر گئے اور دو ننھے ننھے بچے یادگار چھوڑ گئے۔ بی بی نے ان بچوں کو اپنے بچوں کی طرح پالا۔ مرزا بڑھاپے میں انہیں اپنے گلے کا ہار کئے پھرتے تھے۔ جہاں جاتے پالکی میں دونوں بچے ساتھ ہوتے۔ ان کے آرام کے لئے مرزا بے آرام ہوتے تھے۔ ان کی ہر فرمائش پوری کرتے۔ افسوس کہ مرزا کے بعد وہ دونوں لڑکے جوان مر گئے۔ باوجود ان مصائب و آلام کے مرزا غالب خوش طبع، زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے۔ کسی بھی خیال کو ظریفانہ طریقہ سے ظاہر کرنے اکثر کیا کرتے تھے۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے غم
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

آپ کا حافظہ بہت قوی تھا۔ ظرافت اور حاضر جوابی لاجواب تھی آپ کے کئی لطیفے مشہور ہیں۔ ایک دفعہ مرزا بہت ہی مقروض ہو گئے۔ قرض داروں نے نالش کر دی۔ مفتی صاحب کی عدالت میں جوابدہی کے لئے طلب ہوئے۔ جس وقت پیشی پر گئے یہ شعر پڑھا۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مرزا کو اس طرح جیل میں رہنا پڑا کیونکہ بیلے ہو گئے۔ جوئیں پڑ گئیں۔ ایک دن بیٹھے ان میں جوئیں چن رہے تھے ایک رئیس عیادت کو پہنچے پوچھا کیا حال ہے۔ آپ نے کہا۔

ہم غم زدہ جس دن سے گرفتار بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیوں کے ٹانکوں سے سوا ہیں

جس دن وہاں سے نکلے گئے اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو وہاں کا کرتہ وہیں پھاڑ پھینکا اور کہا۔

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

مرزا کی قاطع برہان کے بہت لوگوں نے جواب لکھے اور بہت زبان درازیاں کیں کسی نے کہا حضرت آپ نے فلاں شخص کی کتاب کا جواب نہیں لکھا۔ مرزا نے فرمایا بھائی اگر گدھا تمہارے لات مارے تو تم اس کا کیا جواب دوگے۔ ایک دن مرزا کے شاگرد نے آکر کہا حضرت آج میں امیر خسرو کی قبر پر گیا تھا۔ مزار پر کھرنی کا درخت ہے۔ اس کی کھرنیاں میں نے خوب کھائیں۔ کھرنی کا کھانا تھا کہ گویا فصاحت و بلاغت کا دروازہ کھل گیا۔ دیکھئے تو میں کتنا فصیح ہو گیا ہوں۔ مرزا نے کہا ارے میاں تین کوس کیوں گئے میرے پچھواڑے ببیل کی پھلیاں کیوں نہ کھائیں۔ چودہ طبق روشن ہو جاتے۔

ایک مولوی صاحب ملاقات کو آئے۔ عصر کا وقت تھا رمضان کا مہینہ تھا۔ مرزا نے ملازم سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے کہا مرزا غضب کرتے ہو رمضان میں روزے نہیں رکھتے۔ مرزا نے کہا شیعی مسلمان ہوں چار گھڑی دن سے روزہ کھول لیتا ہوں۔ میں بیمار تھا عیادت کو گئے۔ پوچھا کیا حال ہے وہ بولے مرتا ہوں۔ قرض کی فکر ہے کہ گردن پر لئے جاتا ہوں۔ بھلا کیا فکر ہے۔ خدا کے ہاں کیا مفتی صدرالدین بیٹھے ہیں جو ڈگری کرکے پکڑوا بلائیں گے۔ بھوپال سے ایک صاحب دہلی کی سیر کو آئے مرزا کے ہم خلق تھے۔ ایک دن ملنے گھر گئے۔ مرزا ان سے بہت اخلاق سے پیش آئے۔ اس وقت مرزا بیٹھے سرور کر رہے تھے گلاس اور شراب کا شیشہ آگے رکھا تھا۔ ان بے چارہ کو خبر نہ تھی کہ آپ کو یہ بھی شوق ہے۔ انہوں نے کبھی شربت کا شیشہ خیال کرکے ہاتھ میں اٹھا لیا۔ ایک صاحب پاس ہی سے بولے جناب یہ شراب ہے۔ بھوپالی صاحب نے جھٹ سے شیشہ رکھ دیا اور کہا کہ میں نے شربت کے دھوکے میں اٹھایا ہے۔ مرزا نے مسکرا کر انکی طرف دیکھا اور کہا۔ زہے نصیب دھوکے میں نجات ہو گئی۔

مرزا میں دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی تھیں۔ اول یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوہ خاص تھا۔ دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے انہیں طبعی تعلق تھا اس لئے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دی جاتی تھی کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں۔ لیکن جو شعر صاف صاف نکل گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ اس کا جواب نہیں رکھتے۔ ان کی ظرافت بھی اپنی نوک جھونک سے چوکتے نہیں تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ مرزا بھی مشاعرہ میں تشریف لے گئے تھے۔ حکیم آغا خاں عیش ایک خوش طبع شگفتہ مزاج شخص تھے۔ طرح میں یہ قطعہ پڑھا۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

اس کے بعد آخری عمر میں نازک خیال کے طریقہ کو بالکل ترک کر دیئے تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کا دیوان بہت بڑا تھا۔۔۔۔۔۔

مولوی فضل حق صاحب اور مرزا خاں عرف مرزا فانی صاحب جو کوتوال شہر تھے مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ یہ دونوں باکمال مرزا کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ انہوں نے مرزا کے دیوان کو دیکھا اور مرزا کو سمجھایا۔ اس دیوان کی کچھ غزلیں اور اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ مرزا نے کہا کہ اب اتنا کچھ کہہ چکا ہوں۔ اب تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا جو ہوا سو ہوا انتخاب کرو۔ اور مشکل کلام نکال ڈالو۔ مرزا نے دیوان حوالہ کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے دیوان انتخاب کیا۔ عود ہندی کو نثر میں اد کچھ خطوط۔ اکثر خطوط میں ان لوگوں کے جواب میں جنہوں نے کسی مشکل شعر کے معنے پوچھے یا کوئی امر تحقیق طلب فارسی یا اردو کا دریافت کیا ہے۔ اردوئے معلیٰ ۱۲۸۵ھ ۱۸۶۹ء چند شاگردوں اور دوستوں نے جس قدر اردو کے خطوط ملے ایک جلد ترتیب دئے۔ اس مجموعہ کا نام مرزا نے اردوئے معلیٰ رکھا ان خطوط کی عبارت ایسی ہے گویا آپ سامنے بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں۔ اس کتاب میں چونکہ اصلی خطوط سے معلوم ہوتا ہے دنیا کے رنج و الم ہمیشہ ہیں پریشان کرتے رہے لطائف غیبی اس رسالہ میں مفتی سعادت علی کی طرف سے دو سے سخن ہے۔ اگرچہ کہ اس دیباچہ میں سیف الحق کا نام کہا ہے۔ مگر انداز عبارت صاف کہہ رہی ہے کہ مرزا ہیں۔ تیغ تیز مولوی احمد علی مرزا نے قاطع برہان کے جواب میں موئید البرہان لکھی تھی۔ اس کے بعض مراتب کا جواب مرزا نے لکھ کر فرما کر تیغ تیز نام رکھا۔

ساطع برہان کے آخر میں چند ورق سید عبداللہ کے نام بھی اور بھی مرزا کے ہیں۔ فارسی کی تصنیفات میں قصائد حمد و نعت بادشاہ دہلی شاہ اودھ وغیرہ کی شان میں لکھے ہیں۔ غزلوں کا دیوان مع دیوان قصائد ۱۲۶۳ھ میں مرتب ہو کر نقلوں کے سینہ ورق میں پھیلا۔ پنج آہنگ اس میں طرح آہنگ کے پانچ باب فارسی کے انشاء پردازوں کے لئے جو کہ ان کے نئے انداز میں رکھنا چاہیں یہ عمدہ تصنیف ہے۔ ۱۲۷۸ھ میں قاطع برہان چھپی بعد کچھ تبدیلی اس کو پھر چھپوایا۔ نامہ غالب قاطع برہان کے کئی شخصوں نے جواب دئے۔ چنانچہ میرٹھ میں حافظ عبدالرحیم نابینا تھے۔ انہوں نے اس کا جواب ساطع برہان لکھا۔ مرزا کے خط کے عنوان میں حافظ صاحب موصوف کو بطور جواب چند ورق لکھے۔ اور اس کا نام نامہ غالب رکھا۔ مہر نیمروز حکیم احسن اللہ خاں طبیب خاص بادشاہ کے تھے۔ انہیں تاریخ کا شوق تھا۔ اور اہل کمال کے ساتھ عموماً تعلق خاطر رکھتے تھے۔ مرزا نے ان کے ایما سے اول کتاب مذکورہ کا ایک حصہ لکھا اور اس کے ذریعہ ۱۸۵۰ء میں باریاب حضور ہو کر خدمت تاریخ نویسی پر مامور ہوئے۔ اور نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسداللہ خان غالب نظام جنگ خطاب ہوا۔ چنانچہ پہلی جلد میں امیر تیمور سے ہمایوں تک حال بیان کر کے مہر نیمروز نام رکھا دستنبو اور دق ۱۸۵۷ء سے جولائی ۱۸۵۸ء تک حال لکھا ہے کا ہے۔ سبد چین دو ورق قصائد چند جملے چند خطوط فارسی کے درج ہیں جو کہ دیوان درج ہو چکے تھے۔ آخر میں اپنا کلام اپنے پاس نہ رکھتے تھے۔ اردو کی تصنیفات نواب حسین مرزا صاحب کے پاس اور فارسی کی تصنیفات نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب کے پاس رسالہ کر دئے تھے۔ اور یہ لوگ ترتیب کرتے جاتے۔ مرزا کو ان سے بیس برس پہلے اپنی تاریخ وفات کا ایک مادہ ہاتھ آیا وہ بہت بھایا اور اسے موزوں فرمایا تھا۔

منکہ باشم کہ جاوداں باشم
چوں نظیری نماند طالب مرد
ور بپرسند کدامیں سال
مرد غالب بگو کہ غالب مرد

اس حساب سے مرزا کو ۱۲۷۷ھ میں جا مرنا چاہئے تھا کیونکہ اسی سال شہر میں سخت وبائی ہزاروں آدمی مر گئے۔ ان دنوں جلی بربادی کا غم تازہ تھا۔ چنانچہ میر مہدی کے جواب میں مرزا فرماتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۷۳ پر)

پروفیسر واتی

ایک عظیم شاعر اور انسان دوست

مرزا غالب کا سارا ادبی ورثہ تقریباً ایک سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ نسبتاً چھوٹی سی کتاب نہ صرف ہندوستان میں جہاں اس عظیم شاعر کے راست وارثین رہتے ہیں بلکہ اس ملک کی سرحدوں کے باہر بھی قدر کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے غالب کی ولولہ انگیز شاعری نے اعلیٰ انسان دوستی سے عبارت ہے ساری دنیا کو مسحور کر دیا ہے۔

غالب کو سمجھنے کا سب سے بہترین طریقہ کیا ہے؟ ہم ان کی شاعری کی روح کا ادراک کس طرح کرتے ہیں؟ ان کے واضح شاعرانہ استعاروں کو ہم کس طرح سمجھ سکتے ہیں؟ ان کی شاعری میں جذبات کی ایسی گہرائی کس بات نے پیدا کی؟ اپنی بے پناہ تخلیقی قوت کے ذریعے غالب نے ماضی اور حال کو ہم آہنگ کر دیا۔ مُردہ شاعرانہ ہیئتوں میں جان ڈال دی۔ اور ان کی نشو و نما کر کے انہیں مکمل کیا۔ غالب کی حیرت انگیز شاعرانہ صلاحیتوں کے بارے میں ادبی نقادوں نے بہت کچھ لکھ رہے ہیں اور لکھتے رہیں گے اور ان گہرے فلسفیانہ خیالات کے متعلق جن سے ان کی شاعری عبارت ہے فلسفیوں نے سوچا ہے، سوچ رہے ہیں اور سوچتے رہیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ غالب اپنے عہد سے آگے نکل گئے تھے اور ان کی شاعری ہندوستانی ادب کا ایک حیرت انگیز اور انوکھا واقعہ ہے۔ غالب کس طرح وجود میں آئے؟ اس حیرت انگیز جینیس کو پھلنے پھولنے میں مدد دینے والے کون سے حالات تھے؟ کئی لوگ ان سوالات پر غور کر رہے ہیں۔

کسی بھی عظیم شاعر کی طرح غالب بھی اپنے عہد اپنے ملک اور اپنے عوام سے اٹوٹ طور پر جڑے ہوئے تھے۔ ان کی اہمیت کو صرف اردو اور فارسی زبانوں تک، جن میں انہوں نے شاعری کی تھی محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی شاعری سارے برصغیر ہندوستان کے عوام کے ثقافتی ارتقا کی تاریخ میں ایک اہم کڑی کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی لئے غالب کو بہتر طور پر سمجھنے اور ان کے پیچیدہ و متضاد فلسفے کا بطریق سے جائزہ لینے کیلئے ہم سوویت محققین اس بات کو ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کی شاعری کا ہندوستان کے ادبی عمل کے پس منظر میں، اس کے ارتقا کے انتہائی اہم قوانین کے مطابق جائزہ لیا جائے۔

غالب نے ہندوستان کے ایک مشکل عہد میں زندگی گزاری، ایک ایسا دور جو گہرے ٹکراؤ اور نمایاں تضادات سے بھرپور تھا۔ ایک سماج کی موت اور دوسرے کی پیدائش کا دور، پرانی تہذیب کے خاتمے اور نئی تہذیب کے وجود میں آنے کا دور۔ ان کی شاعری تباہی کے شعلوں میں تپ کر نکھری ہے۔ ان کی شاعری میں، ہر اس چیز کی حس سے شاعر گہرے طور پر وابستہ تھا تباہی پر افسوس و مایوسی کا موضوع، ایک نئی زندگی کے پرمسرت نغموں سے ہم آہنگ ہو گیا ہے۔ اور اس آواز میں انسان کی عظمت و حیات ابدی پر غیر متزلزل اعتماد کی جھلک ملتی ہے۔

پرانے اور نئے، مرتے ہوئے اور ابھرتے ہوئے کا یہ حیرت انگیز امتزاج ۱۹ ویں صدی کے ہندوستانی کلچر کی خصوصیت ہے۔ اسی رنگ میں کئی نغمات سنے جا سکتے ہیں جو ایک دوسرے سے بہت زیادہ ہم آہنگ نہیں ہیں۔ بلکہ کبھی کبھار ایک دوسرے سے مختلف راگ کے حامل ہیں اور کبھی کبھار ایک دوسرے کی آواز کو دبا دیتے ہیں۔ لیکن حساس سننے والے اس نغمے کی اصل روح کو آسانی سے پہچان سکتے ہیں۔

۱۹ویں صدی کا ہندوستانی ادب اپنے مختلف رجحانات کے باوجود، ارتقا کے ایک واضح اور نمایاں راستے کا حامل ہے۔ جو اس ملک کی پوری معاشی، سماجی اور سیاسی زندگی کے مشترکہ رجحان کا آئینہ دار ہے۔ ہندوستانی ماہرین کی اکثریت اس نئے رجحان کو "نشاۃ ثانیہ" کا نام دیتی ہے جبکہ ہم اس کے ساتھ ساتھ اس کو "روشن خیالی" کا دور قرار دیتے ہیں۔

غالب نے ایک ایسے دور میں زندگی گذاری اور شاعری کی، جب اردو ادب ابھی تجربے کی منزل میں داخل نہیں ہوا تھا۔ جب روشن خیالی کی تحریک نے، جو بنگال، مہاراشٹر اور مدراس میں پھیل چکی تھی اور ہندوستان کے ان علاقوں کے ادب پر اثر انداز ہو چکی تھی، اردو ادب پر ابھی اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ لیکن غالب اپنے دور سے آگے تھے انہوں نے اردو شاعری کے مواد و متن کو وسعت بخشی۔ جب ہم غالب کی شاعری سے تصوف کی نقاب اٹھاتے ہیں تو ہمیں جاگیردارانہ عہد وسطیٰ کے مصائب کے بوجھ تلے دبے ہوئے انسان کا المیہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ان کی کئی تخلیقات میں اس خیال کی توثیق کی گئی ہے کہ انسان انتہائی مکمل مخلوق ہے۔ بلکہ وہ خداؤں سے بھی برتر ہے۔ غالب کی انسان دوستی، اپنے ہم عقیدہ بھائی ہندوؤں کے لئے ہمدردی کی حدوں سے بھی آگے نکل گئی ہے۔ جو اٹھارھویں صدی اور انیسویں صدی کے اوائل کے کئی اردو شاعروں کی تخلیقات کی خصوصیت تھی۔ احتشام حسین کے مطابق "وہ محبت اور ہمدردی کو انسان کا سب سے بڑا مذہب سمجھتے تھے۔ ان کے لئے وہ تمام انسان برابر تھے، جنہیں سچائی کے راستے کی تلاش تھی۔ اور جو اپنے عقائد پر مضبوطی سے قائم تھے۔"

غالب نے انسان کی باطنی دنیا کو پوری گہرائی کے ساتھ پیش کرنے میں، اس کے جذبات و احساسات کو سچائی کے ساتھ نمایاں کرنے میں اور نجات کے لئے جدوجہد کرنے والے فرد اور مذہبی کٹر حامیت اور وسطی دور کے تعصب پر مبنی سماج کے درمیان جدوجہد کی ڈرامائیت کو واضح کرنے والی تصویر پیش کرنے میں مہارت و ملکہ حاصل کیا تھا۔ انسان دوستی کے اس اصول کو جو غالب کی شاعری کے لئے فطری تھا، ان کے شاگرد اور مقلد خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنی شاعری میں ...... مزید گہرائی و گیرائی عطا کی۔

غالب کی عظمت اس حقیقت میں بھی مضمر ہے کہ انہوں نے دوسروں سے بہت پہلے جاگیردارانہ تہذیب کے ناگزیر زوال کو سمجھ لیا۔ نئے دور کو ابھرتے ہوئے دیکھ لیا۔ اور نئے عہد کے حقیقی معنے و مفہوم کا اندازہ لگا لیا۔ کئی ہندوستانی ادبی نقادوں نے بجا طور پر کہا ہے کہ انیسویں صدی کی تیسری دہائی کے اواخر میں، کلکتہ کے قیام نے غالب پر گہرا اثر ڈالا۔ اس وقت کے کلکتہ کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کے نئے رجحانات سے غالب کی واقفیت نے انہیں کئی مسائل پر سوچنے کے لئے مجبور کر دیا۔ اور ان کی شاعری میں نئی زندگی کا اضافہ کیا۔ روشن خیالی کے وہ اثرات، جو اردو ادب میں ۱۹ویں صدی کی آخری چوتھائی میں ہی محسوس ہونے لگے تھے۔ اس وقت تک غالب کی شاعری میں پوری طرح ظاہر نہیں ہوئے تھے لیکن بعض حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عظیم شاعر ہندوستان کی معاشی، سماجی اور سیاسی زندگی میں تبدیلیوں سے ہمدردی رکھتا تھا۔ جن کا نتیجہ بعد میں ایک نئے ادب کی نشوونما کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس معاملے میں غالب سر سید احمد خاں سے بھی آگے تھے، جو اردو ادب میں روشن خیالی کی تحریک کے بانی تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ۱۸۵۵ء میں سر سید احمد خاں نے غالب سے کہا کہ وہ ابوالفضل کی "آئین اکبری" کا پیش لفظ لکھ دیں تو غالب نے اس دستاویز پر تنقید کرتے ہوئے یہ مضمون لکھ دیا۔ انہوں نے اس وقت کے ہندوستان میں اس میں اس کو بے کار قرار دیا۔ غالب نے لکھا "ہم اب بھی چقماق سے آگ پیدا کر رہے ہیں۔ جبکہ انگریز ماچس سے آگ حاصل کرتے ہیں۔ اور بھاپ سے چلنے والی ایک مشین کی قوت، ہماری لاتعداد بھینسوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ جو بحری جہازوں اور انجنوں کو حرکت دیتی ہے یہ ایسی حقیقت ہے جو ہمیں سیکھنی چاہئے......"

(بقیہ صفحہ ۴۹ پر)

علی جواد زیدی

غالب کے محققین ـــــ ایک جائزہ

غالب نے کہا تھا کہ ؎

شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

ی گوئی ہی ایک شکایت کا پہلو یہ ہے کہ ان کی
ر عظمت کو ان کے مرنے کے بعد ہی تسلیم کیا جائے
ہم ہمارے عظیم شاعروں اور مصنفوں کی پوری صف
ہی ایسے ملیں گے، جنہیں اپنی زندگی میں اس قدر
ت حاصل ہوئی ہو۔ جتنی مرزا غالب کو اپنی زندگی میں
ی غالب کے دور کے ابتدائی تذکروں میں ان کے
سین کے کلمات ہیں۔ ان کے شاگرد مولانا حالی نے
مکمل سوانح حیات قلم بند کی۔ ان کا کام کئی بار زیور
ے آراستہ ہوا۔ ان کے خطوط، دیباچے اور دیگر
تحریریں جمع اور شائع کی گئیں۔ ان کے دوستوں نے
تصاویر محفوظ رکھیں۔ یقیناً یہ ایک نادر اعزاز تھا۔
ن کی موت کے بعد ان کاموں کو بھرپور طرح
نجام دیا گیا۔ غالب کی زندگی سے متعلق تمام
ب مواد کا پتہ لگایا گیا۔ اس سلسلے میں اس کے
وں، ہم عصروں سے تعلقات، ملاقاتوں، مرثیوں وغیرہ
ت جمع کئے گئے۔ ان کی تصانیف سے متعلق
ے تبصرے لکھے گئے۔ ان کے بارے میں بیسیوں
شائع ہوئیں۔ یہ سب کچھ قابل تحسین و آفریں ہے۔
ے اردو شاعری میں رشک و حسد کا ذکر کیا اور جب
ادبی بحث چلی، تو اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ لیکن
معاصر شاعر تھے۔ تاہم انہوں نے غالب کی شہرت
عظمت کو گرانا چاہا۔ لیکن وہ ایک تنہا شخص تھے۔
ے سکالروں نے غالب پر تحقیقی مطالعے کئے، اپنی
زندگیاں وقف کر دیں۔ آج بھی بہت سی نمایاں شخصیتیں ہیں، جو غالب پر ایک اتھارٹی کی حیثیت رکھتی ہیں۔

غالب یقیناً پوری توجہ کے مستحق تھے۔ یا الفاظ ان کی جاذبیت ہے۔

سودا، میر، نظیر اور انیس ایسے بڑے شاعروں پر پوری طرح نظر نہ پڑنے دی۔ ان کے ہم عصر مشاہیر مومن اور ذوق جزوی طور پر ماند پڑ گئے۔ حالیہ برسوں میں اس صورت حال کا ازالہ ہوا ہے۔ اور سکالروں نے دیگر استادوں کے کلام پر بھی نظر رکھی ہے۔ پھر بھی غالب کے سلسلے میں تحقیقی کام نسبتاً زیادہ تیزی سے ہوا ہے۔ اور جو کچھ ہوا ہے وہ معیاری ہے۔

غالب کی زندگی کے بارے میں ابتدائی حالات عیار الشعرا، عمدہ منتخبہ، گلشن بے خار، سخن شعرا، گلشن ہمیشہ بہار، گلستان بے خزاں اور آثار الصنادید میں ملتے ہیں۔

تذکروں میں غالب کے انتخابات تحقیقی کام سے متعلق سکالروں کے لئے اہم ہیں۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں شعرا کے حالات جمع کرنے کی جو باقاعدہ کوشش کی۔ وہ سابق حوالجاتی مواد کی صورت میں دستیاب سوانحی مواد سے یقیناً بہتر ہے۔

محمد حسین آزاد نے غالب کے مختلف ہم عصروں اور ان کے رشتہ داروں سے رابطہ قائم کر کے معلومات حاصل کیں۔ انہوں نے شاعر کے حالات معلوم کرنے کے لئے ایک سوالنامہ تیار کیا۔ تاہم اس طرح حاصل شدہ مواد زیادہ نہ تھا۔ شاید آزاد نے اس سلسلے میں بڑے ذوق و شوق سے کوشش نہ کی ہو

کیونکہ اُن کے استاد ذوق تھے۔

الطاف حسین حالی نے ادب میں اپنے استاد کی مکمل سوانح حیات مرتب کی۔ اُنھوں نے تمام شائع شدہ مواد کو یکجا کیا۔ اور اپنی ذاتی معلومات کی بنیاد پر اس میں اضافے کئے۔ وُہ پہلے شخص ہیں کہ اُنھوں نے اُن کے خطوط سے کام لیا۔ اور انہیں سوانح حیات کے لئے بنیادی مواد سمجھا۔ ان کے خطوط سے غالب کی زندگی کے بہت سے گوشے بے نقاب ہوئے ہیں۔ ان کے سینکڑوں خطوط اُن کے دوستوں کے پاس جمع تھے۔ خطوط کے دو مجموعے "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" ان کی زندگی ہی میں طباعت کے لئے تالیف کئے گئے۔ "پنج آہنگ" ان کے فارسی خطوط کا مجموعہ ہے۔ یہ ان کی زندگی میں دو بار زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ دوسری بار جو ایڈیشن نکلا۔ اس میں خطوط کی تعداد ۱۰ تک پہنچ گئی۔ منشی نول کشور کے کلیاتِ نثر فارسی میں مزید ۸ خطوط کا اضافہ کیا۔ سید مسعود حسن رضوی نے غالب کے اُن فارسی خطوط کا مجموعہ "متفرقاتِ غالب" کے نام سے شائع کیا۔ جو کلکتہ میں اپنے دوستوں کو لکھے تھے۔ دو سال بعد ۱۹۴۹ء میں قاضی عبدالودود نے "ماثرِ غالب" شائع کی۔ اس میں وُہ خطوط ہیں۔ جو اُنھوں نے ڈھاکہ میں اور کلکتہ میں اپنے دوستوں کو لکھے۔

۱۸۴۸ء کے آس پاس غالب نے فارسی میں خط لکھنا ترک کر دیا تھا۔ اور اردو میں مراسلے کو مکالمے کی صورت میں لکھنا شروع کیا۔ ۱۲۸ خطوط کا پہلا مجموعہ ۱۸۶۶ء میں یکجا کیا گیا یہ کام ممتاز علی خاں میرٹھی نے انجام دیا۔ اور غالب کی وفات سے چار سال قبل شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ اُن کی وفات کے بعد شائع ہوا۔

ریاست رام پور کے حکمرانوں سے غالب کے تعلقات قریب کے رہے ہیں۔ ریاست کے وزیر اعلیٰ کرنل بشیر حسین زیدی نے امتیاز علی عرشی کو اس بات کی طرف متوجہ کر دیا۔ کہ غالب اور رام پور کے حکمرانوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی ہے۔ اسے جمع کرلیں۔ عرشی صاحب نے مکاتیبِ غالب کے نام سے ریاست میں محفوظ ۱۳۰ خطوط کا مجموعہ شائع کیا۔ حقیر اکبرآبادی اور ان کے بیٹے کے نام غالب نے خط بھیجے۔ انہیں نادراتِ غالب میں ش... کر دیا گیا ہے۔ "غالب کی نادر تحریریں" نامی کتاب ... کچھ تازہ خطوط شامل ہیں۔

سابق میں شائع شدہ کچھ خطوط کی ترتیب میں ... مہیش پرشاد نے بڑی کاوش کی ہے۔ اُنھوں ... پورے دلی میں منتشر کچھ دیگر خطوط کا بھی ... چلایا۔ ان کی خواہش تھی۔ کہ اُنہیں تاریخ و... جمع کیا جائے۔ یہ کام ۱۹۴۱ء میں پورا ہوا۔ جب ... خطوط غالب کا پہلا حصّہ شائع ہوا۔ دوسرے حصّے ... مالک رام صاحب نے دوبارہ ترتیب دیا۔ اس کی اش... ہوئی ہے۔ مالک رام صاحب نے پہلے حصّے پر بھی نظ... کی ہے۔ تاکہ کچھ غلطیوں کی اصلاح ہو سکے۔ یہ غلطی... تاریخوں اور خط پانے والوں کے ناموں سے متعلق ہیں۔

محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی نے نادراتِ غالب لکھی ... اس شائع شدہ خطوط کے مختلف حصّوں کو جوڑ دیا۔ ا... کہا کہ یہ خطوط اُن کے پڑدادا کرامت ہمدانی کے نام ہیں۔ حضرات قاضی عبدالودود صاحب اور مالک رام صا... اور مالک رام صاحب نے کڑی اور الگ الگ مقالوں ... ان کا ذکر ہے۔

یہ خطوط مختلف نقطۂ نظر سے اہم ہیں۔ ان خط... کی اشاعت کے بعد اردو نثر میں ایک نئی جان پڑ... فرسودہ طرز کے خطوط کے بارے میں یہ سمجھا گیا ... غیر ضروری مرصع نگاری، اظہار تا بجیت یا بے حال... انداز سے خطوط میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی ... آمد کی بجائے آورد معلوم ہوتے ہیں۔ ان خطوط ... کی ادبی حیثیت میں اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ ان کی ... سے ان کی زندگی کے بہت سے گوشے بے نقاب ہو... غالب کے تقریباً سبھی سوانح نگاروں نے ان خطو... مطالعہ کیا۔ اور انہیں بنیادی مواد کے طور پر استعمال...

حالی کی کتاب "یادگارِ غالب" کے بعد نظامی بدایونی نے نکاتِ غالب لکھی۔ اس میں سوانحی خاکہ پیش کرنے میں زیادہ تر غالب کے اُردو خطوط سے کام لیا گیا۔ ... گستان عالم غلام رسول مہر نے "غالب" نامی کتاب لکھی۔ اس میں غالب کی تحریروں اور خطوط کو بنیادی مواد کے طور پر استعمال کیا۔ یہ غالب کے سلسلہ میں ایک نمایاں اور بیش قیمت اضافہ ہے۔

ان ابتدائی کتابوں نے آنے والے سوانح نگاروں کے لئے راستہ ہموار کر دیا۔ اور تحقیقی مطالعے کے نئے مواقع فراہم کئے۔ مغربی طرز کی پہلی سوانح عمری شیخ محمد اکرام نے غالب نامے کے نام سے لکھی۔ اس کی مدد سے بعد میں "حیاتِ غالب" لکھی گئی۔ شیخ موصوف نے اپنی کتاب میں غالب کا بحیثیت شاعر اور نثر نگار ایک تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس طرح جو مواد اکٹھا کیا گیا۔ اس سے شیخ موصوف نے حکیم فرزانہ نامی کتاب مرتب کی۔ قریب قریب اس زمانے میں مالک رام نے سوانحی مواد اکٹھا کرنا شروع کیا۔ تاکہ غالب کی کتاب کی تمہید میں پیش کیا جا سکے۔ یہ مواد اس قدر ہو گیا۔ کہ ایک تمہید کے حجم سے بڑھ گیا۔ لہٰذا اسے ذکرِ غالب کے نام سے الگ سے شائع کیا گیا۔ یہ ایک باقاعدہ ترتیب دی ہوئی کتاب ہے۔ اور اپنے موضوع کے اعتبار سے جامع ہے۔ اس کے چار ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ہر بار اس کی افادیت اور حجم میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

امتیاز علی عرشی نے اس مواد کو یکجا کیا۔ جو غالب کے ریاست رام پور کے ساتھ تعلقات سے متعلق تھا۔ اس مواد کو مکاتیبِ غالب کی تمہید کے طور پر شائع کیا گیا۔ یہ ان کی زندگی کے حالات میں ایک اہم اضافہ ہے۔

رام بابو سکسینہ کی کتاب تاریخ ادبِ اردو میں غالب سے متعلق ایک باب کے علاوہ انگریزی میں غالب سے متعلق مواد کم ہی تھا۔ اس کتاب کے بعد ڈاکٹر ایس عبداللطیف۔ شری پی۔ ایل لکھن پال اور شری جیا لال کول نے غالب کے اوپر پوری پوری کتابیں لکھیں۔ جناب مالک رام کی کتاب مرزا غالب ان میں ایک اور اضافہ ہے۔ یہ کتاب جناب مالک رام نے نیشنل بُک ٹرسٹ کے لئے لکھی ہے۔ پروفیسر ایم مجیب نے ساہتیہ اکیڈمی کے لئے غالب پر ایک کتاب لکھی ہے۔ رالف رسل اور خورشید الاسلام نے مشترکہ طور پر اقوامِ متحدہ کے تعلیمی سائنسی اور ثقافتی ادارے کے لئے غالب کے خطوط کا ترجمہ کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر بھی ایک کتاب لکھ رہی ہیں۔ بہت سے لوگوں نے غالب کے اشعار کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں محمد مجیب، پی۔ ایل لکھن پال۔ جیا لال کول۔ مالک رام۔ ایچ۔ سی سرسوت، پریا جوہری اور قرۃ العین حیدر کے نام بیان کئے جا سکتے ہیں۔ ان تفصیلی کتب کے علاوہ مختلف رسالوں میں شائع شدہ متفرق مضامین کی تعداد بہت کافی ہے۔ چند برس قبل علی گڑھ میگزین کا غالب نمبر شائع ہوا تھا جس کو بعد میں مختار الدین آرزو نے احوالِ غالب کے نام سے ایک کتاب کی شکل میں مرتب کیا۔ نگار لکھنؤ۔ اردوئے معلیٰ دہلی اور سفینہ بھوپال نے خصوصی ضمیمے نکالے ہیں۔

غالب کے مطالعے کے سلسلہ میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کو مدِنظر رکھتے ہوئے کچھ فرہنگوں کی ضرورت محسوس کی گئی۔ عبدالقوی دسنوی اور اکبر علی خاں نے اس سلسلے میں قابلِ تعریف کام انجام دیا ہے۔ عبدالقوی دسنوی نے صد سالہ برسی کی تقریبات کے موقع پر غالب پر اپنی کتاب شائع کی ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس۔ راشد حسن خاں اور امیر حسن نورانی غالب اکیڈمی دہلی کے لئے انگلش اور اردو میں فرہنگ تیار کر رہے ہیں۔ دیوانِ غالب کی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ ان سے بھی بہت سی مفید معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ دیوانِ غالب میں اکثر ایسے مقامات آتے ہیں۔ جہاں اوسط درجے کے قاری کو شرح کی ضرورت پڑتی ہے۔

جب انگریزی اداروں میں غالب کی کتابوں کو داخلِ نصاب کیا گیا تو ان تصانیف کے پڑھنے میں دُشواریاں آنے والی مشکلات کے لئے شرحوں کی اشاعت کو ضروری سمجھا گیا۔ اب تقریباً ۴۵ شرحیں شائع ہو چکی ہیں۔ سب سے پہلے "وثوقِ صراحت"

سے کام ہے شرحیں لکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ نظم ... حسرت موہانی اور
جوش ملسیانی کی شرحیں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ایک بڑی بدقسمتی
کی بات یہ ہے کہ ان شرحوں میں صرف غالب کی اردو شاعری
پر ہی توجہ دی گئی ہے۔ اور فارسی شاعری کو بالکل نظر انداز
کر دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ صرف ایک مخصوص طبقہ ہی غالب
کی فارسی شاعری سے واقف ہے۔ لیکن امید کی جاتی ہے کہ غالب
کی صد سالہ برسی کے موقعہ پر غالب کے فارسی دیوان کی اشاعت
لوگوں میں ان کے فارسی کلام سے دلچسپی پیدا کرے گی۔ اور
فارسی کلام کی شرحیں بھی لکھی جانے لگیں گی۔

نگارشاتِ غالب کا ادب میں مقام متعین کرنے کے لئے
غالب پر لکھی گئی کتابوں میں بھی کوشش کی گئی ہے۔ البتہ
عبدالرحمان بجنوری کی کتاب محاسنِ کلامِ غالب کو بے شہرت حاصل
ہے۔ کہ اس میں شاعر کی شخصیت فن اور فلسفہ کا تفصیلی جائزہ
پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ خورشید اسلام
کی کتاب غالب شوکت سبزواری کی کتاب فلسفہ کلام غالب
اور ظ۔ انصاری کی کتاب غالب شناسی بھی قابلِ ذکر ہیں۔
غالب کا کلام اور فن۔ مقامِ غالب۔ نقدِ غالب اور ڈاکٹر
کے ابو الحکیم کی افکارِ غالب بھی قابلِ
قدر کتابیں ہیں۔

قاضی عبدالودود صاحب نے اپنی
کتاب نقدِ غالب میں غالب کے مرتبے
سے متعلق ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے
اس مضمون کا عنوان ہے "غالب بحیثیت
محقق" اس مضمون میں انہوں نے کہا ہے
کہ یہ عظیم شاعر بھی فیصلے کی غلطیوں سے
مبرا نہیں قرار دیا جا سکتا۔ انہوں نے
اپنے مضمون میں غالب کے متعین بیزار زیادہ
جوش و خروش سے احتراز پر زور دیا ہے
قاضی عبدالودود غالب کی بہت سی
کتابوں کو مرتب کر رہے ہیں۔ جہاں غالب کے نام سے ان کی بہت
سی تحریریں غالب سے متعلق ہیں۔ یہ اعلیٰ معیار کے تحقیقی
کام کا نمونہ ہے۔

مالک رام کی کتاب تلامذۂ غالب، غالب کے اوپر لکھی گئی
کتابوں کے درمیان ایک اہم رابطہ قائم کرتی ہے۔ انہوں
غالب کے شاگردوں کے حالات سے متعلق ضروری تاریخ
اور ان کی شاعری کے نمائندہ نمونے جمع کئے ہیں۔

اس کتاب کا مزید مواد فراہم ہونے کی وجہ سے اب
اس کے دوسرے ایڈیشن نکالنے کی تیاری کر رہے ہیں
موصوف غالب کے معاونین اور دوستوں سے متعلق بھی
کتاب کے ذریعے اس رابطے میں مزید اضافے کی سو
رہے ہیں۔

بہت کچھ دستاویزی مواد بھی جمع کیا گیا ہے بشمول
کی قلمی کتابیں یا نسخے دوسری متفرق تحریریں ان کے دور
کے چھپے ہوئے ایڈیشن اور دوسری تصانیف ان کے اور
ان کے قریبی دوستوں کی تصاویر اور کوئی مختلف ذرائع
جمع کئے گئے ہیں۔ سب سے زیادہ جمع شدہ مواد اکبر علی خان
کے پاس ہے جنہوں نے اس میں مزید مفید حاشیوں کا اضافہ
ہے۔ اور امید ہے جلد ہی اسے کتاب کی شکل میں شائع کر
دیا جائے گا۔ اس کا کچھ حصہ
پرتھوی چندر کی کتاب "مرقع غالب"
میں چھپ چکا ہے۔

ریسرچ سکالروں کے لئے ضروری
ہے کہ انہیں تمام قلمی نسخوں اور غالب
کی تصانیف کے چھپے ہوئے تمام
ایڈیشنوں کا علم ہو۔ نئے قلمی نسخوں
یا کچھ کم روشناس منتخب کلام کو غالب
کی تصانیف میں شامل کیا جا سکتا ہے۔
اس کی تلاش شروع ہو گئی ہے۔ اور
دور دراز جگہوں سے ہر ممکن تازہ مواد
حاصل کیا جا رہا ہے۔ غالب کی اردو
اور فارسی بہت سی تصانیف کی نشاندہی۔ اس کے علاوہ
نادر نامہ ہے۔ یہ مختصر کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔

ردِ عمل

مری برسی منائی جا رہی ہے
مری عظمت بڑھائی جا رہی ہے
مگر یہ کیا ستم ہے ہم نشینو!
مری بولی مٹائی جا رہی ہے

(صابر ابوھری)

برہان قاطع سے پیدا شدہ اختلافات کی وضاحت کے لئے انہوں
نے نامۂ غالب اور تیغ تیز کتابیں لکھیں۔ مالک رام نے غالب
پر لطائفِ غالب نام کی ایک اور کتاب لکھی۔

اس سلسلے میں کافی تحقیقی کام ہو جانے کے باوجود سکالروں
کے لئے اب بھی تحقیق کا ایک وسیع میدان ہے۔ شاعر
کی عالمگیر شہرت سے فائدہ اٹھا کر اس کے مجموعے میں جعلی غزلیں
اور بناوٹی جھوٹے خطوط بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ نارنگ ساقی
کی کتاب۔ غالب کا الحاقی کلام" میں ان اضافوں پر اظہار رائے
کیا گیا ہے۔ جو آسی نے شرح کلام غالب میں کئے ہیں۔

غزل کے شعروں یا قصیدوں پر نظرِ ثانی اور بعد کے
ایڈیشنوں میں غالب کا انہیں مسترد کرنا بھی ایک مسئلہ ہے۔
یادداشت کی کمی وغیرہ کے باعث اصل مسودوں میں بھی
غلطیوں کا امکان ہو سکتا ہے۔ باقاعدہ تحقیق سے اب یہ سب
باتیں سامنے آ رہی ہیں۔

غالب کی تحریروں میں تاریخی اور سماجی دلچسپی کا مفید
مواد موجود ہے۔ اور اس نقطۂ نظر سے ان کی تحریروں
کا تجزیہ مفید ہو گا۔

* * *

نوبہار صابر

رباعیات

نوبہار صابر

ہر شاخ و شجر تیغِ رواں کی زد میں
ہر غنچہ و گل برقِ تپاں کی زد میں
غالب نے جسے خونِ جگر سے سینچا
وہ گلشنِ اردو ہے خزاں کی زد میں

انگشت بدنداں ہیں زمانے والے
لڑکھڑا رہے ہیں گنگنانے والے
کرتے ہیں مشاعرے بیادِ غالب
غالب کی زباں کو بھول جانے والے

کیوں سوختۂ دوزخ اسلاف کرو؟
جنت میں بھی داخلی اعراف کرو
غالب کی شاعری منانے والو
غالب کی زباں سے بھی انصاف کرو

فکر تونسوی

چچا غالب کے نام ایک خط

بلیماراں — دہلی

پیارے چچا!

یہ خط میں بلیماراں کے ایک چائے خانے سے تحریر کر رہا ہوں۔ سوچا چچا غالب بھی بلیماراں میں بیٹھ کر احباب اور عزیزوں کے نام خطوط تحریر کیا کرتا تھا۔ جس سے ان خطوط میں حسن کشش اور جادو پیدا ہو جاتا تھا۔ چاردانگ ہندوستان میں ان خطوط نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ لہٰذا میری ناقص سمجھ میں آیا کہ میں بھی بلیماراں میں بیٹھ کر ہی خط لکھوں۔ کیونکہ خوبی نہ غالب میں تھی نہ خطوط میں بلکہ بلیماراں میں تھی۔ شاید بلیماراں میں خط لکھنے سے انسان عظیم ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے میں بھی عظیم ہو جاؤں — ہی انسان کو عظیم بننے کیلئے کتنے فریب کھانا پڑتے ہیں۔

جیسا کہ صد سالہ جشنِ غالب کمیٹی کی طرف سے تمہیں اطلاع کر دیا ہوگا۔ کہ ہم ہندوستانیوں کو ایک دم تمہاری عظمت کا احساس ہو گیا ہے۔ اور ہم نے تمہاری عظمت کا سکہ بٹھانے کیلئے لاکھوں روپے خرچ کرنے کا ایک منصوبہ بنایا ہے۔ تمہارے انتقال کے سو سال بعد ہم تمہاری قدر و منزلت کے قائل ہوئے ہیں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ہر آدمی کی قدر اس کے مرنے کے بعد کیا کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم زندہ انسانوں کے نہیں مردہ انسانوں کے پجاری ہیں۔ جس شخص کو ہم زندگی میں ایک پیالہ گوشت کا شوربہ اور آدھا پاؤ شراب مہیا نہ کر سکے۔ اس کے مرنے کے بعد ہم اس کی قبر کی چادر پر شراب کے گھڑے انڈیل دیتے ہیں۔ اور گوشت کی دیگیں پکا پکا کر غریبوں کو کھلاتے ہیں۔ چچا غالب! تمہیں یاد ہوگا، تم نے ایک بار کتنی حسرت کے ساتھ لکھا تھا کہ ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

چنانچہ تمہاری پیشین گوئی صحیح نکلی۔ آخر وہ دن آ گیا ہے جب تمہاری ۱۸۶۹ء کی فاقہ مستی ۱۹۶۹ء میں رنگ لائی ہے۔ ایک تمہارا قرض لاکھوں روپے خرچ کرکے چکا رہے ہیں۔ تمہارے نام کی ڈاک ٹکٹ جاری کر رہے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تمہارے قصے دوہرا رہے ہیں۔ تمہارے نام کی لائبریری، تھیٹر ہال، تمہارا بُت، تمہاری یادگار ایک عظیم الشان بلڈنگ۔ جس کا ہزاروں روپے کا بنیادی پتھر چوری بھی ہو گیا ہے لیکن ہم اس چوری سے بھی ہرگز نہیں ڈرے۔ ایک پتھر ٹوٹ گیا تو ہزاروں روپے خرچ کرکے دوسرا پتھر لے آئیں گے۔ کیونکہ ایک سو سال پہلے تم نے ہی تو کہا تھا ؎

اور لے آئیں گے بازار سے گر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

تمہاری یادگار کا بنیادی پتھر جامِ سفال تھا۔ جسے کوئی سفلہ صفت آدمی چرا کر لے گیا۔ کچھ کم فہم لوگ جو رسوا نہیں ہونا چاہتے کہتے ہیں یہ پتھر چرایا نہیں گیا۔ ایک حادثہ میں زخمی ہو گیا۔ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اور بچے یہ ٹکڑے کھیلنے کیلئے اٹھا لے گئے۔ یہ دنیا تو بچوں کا کھیل ہے۔ تم واقعی پیغمبر تھے۔ چچا غالب جب تم نے یہ شعر کہا تھا ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ہر حال چچا! اس وقت جبکہ ہم تمہاری حسین و جمیل یاد کا جشن منا رہے ہیں۔ نجانے تمہارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ شاید تمہارا بھی جی چاہتا ہوگا کہ دلّی آ جاؤں۔ اور اپنا جشن اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ میں نہیں جانتا جشنِ غالب کمیٹی نے

تمہیں دعوت نامہ بھیجا ہے یا تمہاری موجودگی کے تصور سے وہ غم کھا گئے ہیں۔ لیکن اگر تم بیچ بیچ آ جاؤ تو اپنی دہلی میں حیرت انگیز تبدیلیاں پاؤ گے۔ بلکہ ایک دہلی کی بجائے یہاں کئی دہلیاں پاؤ گے۔ پرانی دہلی، نئی دہلی، جنوبی دہلی، مغربی دہلی، جھگیوں کی دہلی۔ جھگی جھونپڑیوں والی دہلی، بنگلوں اور ہوٹلوں کی عظیم الشان عمارتوں والی دہلی۔ تمہاری دہلی جو قلعہ معلیٰ سے بلیماراں تک محدود تھی اب چیل چوک اعظم بن گئی ہے۔ تم سے تو پہچانی بھی نہ جائیگی۔ لال قلعہ اگرچہ وہیں ہے۔ لیکن اس کی دیوار کے سایہ میں فرنگی بھی چھوکرے اور چھوکریاں بیٹھ کر چرس کے دم لگاتے ہیں۔ اور تمہارا شعر پڑھتے ہیں ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

اور لال قلعہ کے اندر جہاں کبھی مینا بازار لگتا تھا اور مغل شہزادیاں اپنے حسن و جمال کی جگمگاہٹ کے ساتھ تفریحِ طبع کے طور پر سیلز گرل بن کر ریجھا کرتی تھیں، وہاں اب سموسے اور آلو کی ٹکیاں اور مونگ پھلیاں بکتی ہیں۔ قلعہ معلّٰی کے اندر جہاں کبھی بہادر شاہ ظفر کی زیرِ صدارت ہنگامہ خیز مشاعرے ہوا کرتے تھے آج کل وہاں تمہاری لاش کو خوبصورت فریب دینے کے لئے اردو مشاعرے ضرور منعقد ہوتے ہیں جن میں واردات و قلب و جگر کی بجائے پچاس پچاس کے تذکرے کیے جاتے ہیں۔ اور مشاعرے کے ساتھ ساتھ ہندی مشاعرے بھی گھس پیٹھ کر رہے ہیں۔ کیونکہ اردو جو کبھی قوم کی خفری ستھری زبان سمجھی جاتی تھی، اب اسٹینڈرڈ کا سٹ ہو کر رہ گئی ہے۔ ہندی اب قلعہ معلّٰی کی خیمہ عیاشی بن گئی ہے۔ اس لئے ادب و علم کا تاج اس نے اردو کے سر سے چھین کر اپنے سر پر پہن لیا ہے۔ اور اب تو سنا ہے چچا زبان پنجابی زبان کا ایک مشاعرہ بھی ہونے والا ہے۔ مغل سلطنت کا زوال تو سنا تھا، لیکن اردو مشاعروں کا زوال اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

مگر اس زوال کے باوجود چچا ہم تمہارا صد سالہ جشن منا رہے ہیں۔ اور غضب خدا کا کہ جن لوگوں نے اردو کو دیس نکالا دینے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا وہی بڑھ چڑھ کر تمہارا جشن منا رہے ہیں۔ میں نہیں سمجھ پاتا کہ یہ جشن ہے یا ماتم اور یہ ماتم غالب کا ہے یا اردو کا؟ حیرت ہے کہ اس ماتمی جشن میں دہلی کے جن سنگھی حکمران بھی شرکت فرما رہے ہیں۔ تم نے ایک بار رقیب کے متعلق ذکر کیا تھا۔ وہ محبوبہ کے ساتھ تمہارے گھر کی طرف آیا تھا تو تم جل بھن کر کباب ہو گئے تھے۔ لیکن اب پھر وہی تمہاری محبوبہ اردو کا رقیب تمہارا جشن منانے کے لئے لال قلعہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور تم ؎

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

چچا جان! یہ خط میں بلیماراں کے چائے خانے کی چوبی بنچ پر بیٹھ کر لکھ رہا ہوں۔ تمہارا گھر میرے سامنے ہے۔ جو اب تمہارا گھر نہیں لگتا بلکہ ماتم کدہ لگتا ہے۔ اور میں سوچ رہا ہوں آخر اس ماتم کدے میں غالب کا جشن منانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی۔ کوئی نہ کوئی ڈپلومیٹک ضرورت ہوگی۔ ورنہ بقول تمہارے تھا ؎

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

ایک عظیم شاعر

.... صفحہ ۳۴ سے آگے

غالب کی شاعری اور فلسفہ اردو ادب کے ارتقا کا ایک اہم سنگِ میل ہے۔ اس نے اس ادب کے افق کو وسعت عطا کی۔ اس کو جاگیردارانہ اور دورِ زوال کے کلچر سے ناطہ توڑنے میں مدد دی۔ مختلف قسم کے مذہبی اور فلسفیانہ نظریات سے الگ کیا۔ اس کو نیا انسان دوست متن و مواد عطا کیا۔ اس ادب کو کل ہند انداز عمل کے مشترکہ دھارے میں شامل کرنے کی زمین ہموار کی۔ اور آگے چل کر اردو ادب میں ترقی پسند جمہوری رجحانات کے فروغ و ارتقا کے لئے سازگار حالات پیدا کئے۔

ہماری رائے میں خاص طور پر اسی میں اسی حیرت انگیز شاعر اور انسان دوست غالب کی عظمت کا راز مضمر ہے۔ اسی لئے آج ان کی موت کے ایک سو سال بعد بھی ان کی شاعری اتنی تابناک اور ولولہ انگیز معلوم ہوتی ہے۔

عبدالحمید عدم

غزل

باتوں پہ بھی تر زباں ہیں، گھاتوں پہ بھی دوانی ہیں
نام تیری محبت کے، مجذوب پجاری ہیں

شاہوں کے درواروں میں، کیا ڈھونڈتا پھرتا ہے؟
یہ لوگ تو اے پاگل، خود آپ بھکاری ہیں!

انجام یہی اکثر، ہر کھیل کا دیکھا ہے
نادانیاں جیتی ہیں، دانائیاں ہاری ہیں

یوں بھی تو نہیں جیتے، بُت خانہ و کعبہ میں
ان دونوں مکانوں میں، باتیں تیری جاری ہیں

میں نے تو نہیں دل میں، آباد کئے مندر
اصنام کی تصویریں، یزداں نے اتاری ہیں

منزل پہ پہنچنے کا، کھٹکا ہی نہیں کوئی
رہبر بھی لٹیرے ہیں، رہزن بھی شکاری ہے

ہر چند حسینوں تک، نہ پہنچے تماشائی تو
صد شکر! حسینوں نے زلفیں تو سنواری ہیں

مجھ سے کبھی دو پل، ہنگام سحر آجا
فرقت کی کٹھن راتیں مر مر کے گزاری ہیں

ہو توں میں عدم اٹکے، بوندیں ہیں جو امرت کی
محسوس یہ ہوتا ہے کچھ ان میں ہی جاری ہیں

نئے ادب کا ترجمان

نئے اور پرانے فنکاروں کی

تخلیق کا آئینہ دار

ماہنامہ "بال و پر"

عنقریب منظر عام پر آ رہا ہے!

فن کارانہ تخلیق اور

مشتہر حضرات سے

اشتہار کی درخواست ہے

پتہ:۔ مدیر "بال و پر" چھیکن ٹولہ فتح پور (یو۔پی)

گوشوارہ

بابت ملکیت و دیگر تفاصیل متعلقہ ماہنامہ "جان نثار" امرتسر

فارم نمبر ۴

۱۔ مقام اشاعت	امرت سر
۲۔ وقفہ اشاعت	ماہنامہ
۳۔ پرنٹر کا نام	رام لال بھنڈاری
قومیت:۔	بھارتیہ
پتہ:۔	۹۰ سبھاش نگر، کٹرہ شیر سنگھ۔ امرت سر
۴۔ پبلشر کا نام	رام لال بھنڈاری
قومیت:۔	بھارتیہ
پتہ:۔	۹۰ سبھاش نگر کٹرہ شیر سنگھ۔ امرت سر
۵۔ ایڈیٹر کا نام	رام لال بھنڈاری
قومیت:۔	بھارتیہ
پتہ:۔	۹۰ سبھاش نگر کٹرہ شیر سنگھ امرت سر
۶۔ واحد مالک:۔	رام لال بھنڈاری

میں رام لال بھنڈاری اعلان کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا تفاصیل میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط:۔

رام لال بھنڈاری

مرثیۂ غالب

الطاف حسین حالی

دل کو باتیں جب اُس کی یاد آئیں
کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں
کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل
کس سے دادِ سخن وری پائیں
مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب
کس سے اصلاح لیں، کدھر جائیں
پستِ مضموں ہے نوحۂ استاد
کس طرح آسماں پہ پہنچائیں
لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں
اہلِ میّت جنازہ ٹھیرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالبؔ کو
سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں
اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح
اہلِ انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم
لوگ جو چاہیں ان کو ٹھیرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں
غالبِؔ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

بزمِ غالب کے چند فن کار

[illegible] رام وفا

ماہر القادری

صابر ابوہری

گوپال متل (ایڈیٹر تحریک)

رفعتی پشاوری

پورن سنگھ ہنر

رام رتن مضطر

گوہیار صابر

حکیم [illegible] احمد [illegible]

لال چند دل

رام کرشن مشتاق

علامہ اقبال

خراجِ عقیدت

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا　　　ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا　　　زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر　　　محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر　　　خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر
آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں　　　ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے! اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سرزمیں　　　آہ! اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں
گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے

اے جہان آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر　　　ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر　　　یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

میلا رام وفا

نذرِ غالب

التفاتِ عام ہے وجہِ پریشانی مجھے
کس قدر مہنگی پڑی ہے اپنی ارزانی مجھے

بحرِ ہستی ہے مری نظروں میں اک نقشِ سراب
ریت کا ہوتا ہے دھوکہ دیکھ کر پانی مجھے

تیرے جلووں کا تو ہر اک ذرہ ہے آئینہ دار
مانعِ نظارہ ہے خود میری حیرانی مجھے

سعی بے حاصل تھی دل کی کوششِ اخفائے راز
کر گئی رسوا نگاہوں کی پریشانی مجھے

یا عدو نے بوالہوس کی ناز برداری کرو
یا بنا لو تختۂ مشقِ ستم رانی مجھے

کھل نہیں سکتی تھی اک آپ کے دل کی گرہ
ورنہ کیا کیا گتھیاں آتی نہیں سلجھانی مجھے

کس قدر ناپید ہیں اہلِ کمال اب اے وفا
کوئی اپنا بھی نظر آتا نہیں ثانی مجھے

صبر مشکل تھا محبت کا اثر ہونے تک
جان ٹھہری نہ دلِ دوست میں گھر ہونے تک

شبِ فرقت کی بھی ہونے کو سحر تو ہو گی
ہاں مگر ہم نہیں ہونے کے سحر ہونے تک

فرصتِ ماتمِ پروانہ کہاں سے آئے
شمع کو موت سے لڑنا ہے سحر ہونے تک

سہتے ہیں جورِ ستم۔ جیتے ہیں رنج و الم
یعنی کرتی ہے بسر عمر بسر ہونے تک

تیرا پردہ بھی اٹھائے گی مری رسوائی
تیرا پردہ ہے مرے خاک بسر ہونے تک

اے وفا معرکۂ عشق تو سر کیا ہو گا
ہو چکیں گے ہمیں یہ معرکہ سر ہونے تک

دل کی تسکیں کا آسرا نہ ہوا
ستم ان کا کرم نما نہ ہوا

زخم وہ کیا جو بھر گیا آخر
درد وہ کیا جو لادوا نہ ہوا

میرے نالوں سے ہل گئے افلاک
تیرے دل پر اثر ذرا نہ ہوا

کیا بلا ہے تری نگاہ کا تیر
جو خطا ہو کے بھی خطا نہ ہوا

تو نہ چاہے تو اور بات ہے یہ
تو نے چاہا اگر تو کیا نہ ہوا

تیغ جب امتحاں کی اٹھی
کوئی آگے مرے سوا نہ ہوا

تیرے دل کی گرہ ہے وہ عقدہ
آج تک جو کسی سے وا نہ ہوا

تار ٹوٹا ترے تغافل کا
مر گیا میں تو کچھ بجا نہ ہوا

ٹیس دل کی کبھی فرو نہ ہوئی
ہاتھ دل سے کبھی جدا نہ ہوا

دیر اس نے بھی کی تو آنے میں
صبر تجھ سے بھی اے وفا نہ ہوا

سردار جعفری

غالب

آسمانوں کی بلندی کو بڑا ناز تھا
پست حیرت میں تھے ذوقِ رفعتِ پرواز تھا

رہگزارِ ماہ و انجم تک کوئی جاتا نہ تھا
کوئی شاخِ کہکشاں پر زمزمہ گاتا نہ تھا

عرش پر جبریل کا دمساز ہو سکتا تھا کون
طائرِ سدرہ کا ہم آواز ہو سکتا تھا کون

جو لگا دے آگ کوئی نغمہ زن ایسا نہ تھا
تجھ سے پہلے کوئی داؤدِ سخن ایسا نہ تھا

تو نے چھیڑے ہیں وہ نغمے شاعری کے ساز پر
لحنِ داؤدی کو رشک آئے تری آواز پر

تیرا بربط کہکشاں، ناہید ہے تیرا رباب
آسماں پیدا ہے ترے بحرِ تخیل کا حباب

تیرا نغمہ ساحری، تیرا بیاں پیغمبری
تیرے حصے میں ہے تعلیمِ سخن کی

تیری فکرِ نکتہ رس حسنِ تخیل کا شباب
شعر تیرا معجزہ، تیری کتاب

وہ صداقت، وہ حقیقت، وہ جمالِ برق پا
زندگی جس کے لئے ... سے سرگرم تلا

وہ صداقت عکس افگن ہے تری تقریر پر
وہ حقیقت جلوہ فرما ہے تری تحریر پر

حسن کے جلووں سے جب محروم ہو جاتے ہیں
کذب کے ظلمت کدوں میں جا کے کھو جاتے ہیں

جب کہ ہوتا ہے شبِ غم میں ہلالوں کا
جب نگاہیں پھیر لیتے ہیں مہ و مہر و نج

شعر تیرے جگمگا اٹھتے ہیں اس ظلمات
جس طرح جگنو چمکتے ہیں اندھیری برسات

تو نے دل گرم سینوں کو فروزاں کر
روح کو روشن دماغوں کو چراغاں کر د

تو نے ڈالی شمعِ ماضی کے سیہ خانے
نور تیرا حال و مستقبل کے کاشانے میں

تیرے گلشن کی بدولت گل بداماں ہم بھی
تیرے نغموں کے اثر سے نغمہ ساماں ہم بھی

ساحر لدھیانوی

جشنِ غالب

اکیس برس گزرے آزادیٔ کامل کو
تب جا کے کہیں ہم کو غالب کا خیال آیا
تربت ہے کہاں اس کی، مدفن تھا کہاں اس کا
اب اپنے سخن پرور ذہنوں میں خیال آیا

سو سال سے جو تربت چادر کو ترستی تھی
اب اس پہ عقیدت کے پھولوں کی نمائش ہے
اردو کے تعلق سے کچھ بھید نہیں کھلتا
یہ جشن، یہ ہنگامہ، خدمت ہے کہ سازش ہے

جن شہروں میں گونجی تھی غالب کی نوا برسوں
ان شہروں میں اب اردو بے نام و نشاں ٹھہری
آزادیٔ کامل کا اعلان ہوا جس دن
اس ملک کی نظروں میں غدار زباں ٹھہری

جس عہدِ سیاست نے یہ زندہ زباں کچلی
اس عہدِ سیاست کو مرحوموں کا غم کیوں ہو؟
غالب جسے کہتے ہیں اردو ہی کا شاعر تھا
اردو پہ ستم ڈھا کر غالب پہ کرم کیوں ہو؟

یہ جشن، یہ ہنگامے، دلچسپ کھلونے ہیں
کچھ لوگوں کی کوشش ہے، کچھ لوگ بہل جائیں
جو وعدۂ فردا پر اب ٹل نہیں سکتے ہیں
ممکن ہے کہ کچھ عرصہ اس جشن پہ ٹل جائیں

یہ جشن مبارک ہو، پر یہ بھی صداقت ہے
ہم لوگ حقیقت کے احساس سے عاری ہیں
گاندھی ہو کہ غالب ہو، انصاف کی نظروں میں
ہم دونوں کے قاتل ہیں، دونوں کے پجاری ہیں

رتنی پٹیالوی

غزل

ترا غم اگر جہاں میں مرا غم گسار ہوتا
غمِ ناگوار تک بھی مجھے سازگار ہوتا

وہ جو تجھ کو ڈھونڈتے ہیں انہیں کیوں نہ ہوش آتا
ترا جلوۂ فسوں گر اگر آشکار ہوتا

میرے دل پہ چھا نہ جاتا جو کوئی بہار بن کر
میری چشمِ بے نظر میں گلِ تر بھی خار ہوتا

یہیں حسرت آج تک ہے دلِ ناتواں پہ
غمِ عشق کی خلش سے کہیں ہمکنار ہوتا

ترے اعتبار پر ہم یونہی تیری راہ تکتے
ہمیں اپنی زندگی پر اگر اعتبار ہوتا

جو نظر تلاش کرتی وہ کہیں نہ دور ملتے
وہ کبھی ضرور آتے اگر انتظار ہوتا

مجھے کیا خیال گزرا شبِ غم جب آ گئے وہ
ابھی کچھ دن اور ان کا یونہی انتظار ہوتا

اگر اس قدر تو ہوتا میری سرگزشتِ غم میں
جو میرا فسانہ سنتا وہی اشکبار ہوتا

نہ قرارِ دل کا جاتا نہ سکونِ جاں کو روتے
نہ کسی سے آنکھ لڑتی نہ کسی سے پیار ہوتا

تجھے دیکھ کر برابر تجھے دیکھتے ہی رہتے
ہمیں اپنی بے خودی پر اگر اختیار ہوتا

ترے غم میں دل جو مٹتا تو مزے کی بات ہوتی
تری یاد سے گزر کر تری یادگار ہوتا

کسی دردِ لا دوا سے یونہی اس طرح تڑپتے
تو یہی کچھ قرار سامانِ دلِ بے قرار ہوتا

نوبہار صابر

غزل

ظلمتِ شب سے الجھنا ہے سحر ہونے تک
سر کو ٹکراتا ہے دیوار میں در ہونے تک

اب کہ تو لطفِ سراپا ہے تو کیا ذکر کریں
دل پہ کیا گزری ہے آہوں میں اثر ہونے تک

اب تو اس پھول کی نکہت سے مہکتی ہے حیات
زخمِ دل زخم تھا تہذیبِ نظر ہونے تک

دل ہی جلنے دو شبِ غم جو نہیں کوئی چراغ
کچھ اجالا تو رہے گھر میں سحر ہونے تک

اب پیام آتا ہے ان کا نہ سلام آتا ہے
تھے یہ سب لطف مرے قیدِ نظر ہونے تک

خونِ دل ارضِ گلستاں کو دیے جا صابر
کانٹے کانٹے کو حریفِ گلِ تر ہونے تک

نوبہار صابر

رباعیات

یہ طرفگیٔ فکرِ جواں کیا کہنا
یہ چاشنیٔ لطفِ زباں کیا کہنا
ہیں اور بھی شاعر بہت اچھے لیکن
غالب ترا اندازِ بیاں کیا کہنا

زہرابِ غمِ دہر پیا ہنس ہنس کر
ہر زخمِ تمنا کو سیا ہنس ہنس کر
محبوس بندِ الم اور نہیں قیدِ حیات
یہ سوچ کے غم میں بھی جیا ہنس ہنس کر

ہے سب سے جدا رنگِ سخن غالب کا
یکتائے جہاں ہے بانکپن غالب کا
موضوعِ سخن، حسنِ زباں، طرزِ ادا
ہر طور سے منفرد ہے فن غالب کا

ڈھونڈا یہ دیئے عمر بسر ہونے تک
مٹ جائیں نہ آہوں میں اثر ہونے تک
اک شمع تھی غالب کیلئے زیست کہ جو
ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

الہام کی تصویر گری لگتا ہے
غالب کا ہر اک شعر وحی لگتا ہے
کرتا ہے جب اسرارِ تصوف کے بیاں
یہ رندِ خرابات ولی لگتا ہے

دی آب جو الفاظ نظر سے تو نے
ذرے کو بڑھا دیا گہر سے تو نے
اردو کا چمن کیوں نہ ہو رشکِ فردوس
سینچا ہے اسے خونِ جگر سے تو نے

مقبول نہ مسلمان کہا غالب نے
انسان کو انساں کہا غالب نے
جس کفر سے ہو عظمتِ آدم کی نمود
اس کفر کو ایمان کہا غالب نے

اس شان سے انجمن میں آیا غالب
ہر ذہن پہ ہر قلب پہ چھایا غالب
خورشیدِ جہاں تاب کی صورت صابر
دنیائے سخن میں جگمگایا غالب

صابر ابوہری ایم اے

غزل

کیا کشش اللہ رے دنیائے آب و گل میں ہے
تا ابد جینے کی خواہش ہر بشر کے دل میں ہے

بیت جائے کیا خدا جانے جہانِ شوق پر
وہ تو کہیے لیلیٰ حسنِ ازل محمل میں ہے

کچھ ہمیں سمجھا تے ہیں رُوئے تاباں کو ترے
ذکر تیرے حسن کا کہنے کو ہر محفل میں ہے

کاش یہ کھل جائے تجھ پر اے اسیرِ آب و گل
اک سرورِ بیکراں تسخیرِ آب و گل میں ہے

سوچ کر اے عقل کرنا عزمِ بحرِ عشق کا
ایک طوفانِ بلا ہر موجِ ساحل میں ہے

کوئی محرم ہی نہیں جب رازہائے عشق کا
ہم کسی کو کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے

عشق نے طے کر لئے ہفت آسماں مدت ہوئی
عقلِ ناداں گم ابھی تک جادۂ منزل میں ہے

رہزنِ ہوش و خرد ہے جلوہ گاہِ حسنِ ناز
خود سے بیگانہ ہے صابرؔ! جو بھی اس محفل میں ہے

ماہر القادری

غالب

غزل کو نیا پیرہن دینے والے
تصور کو اک انجمن دینے والے

حسینوں کو ذوقِ سخن دینے والے
غزالوں کو مشکِ ختن دینے والے

رخِ شاعری کو پھبن دینے والے
زباں کو حسیں بانکپن دینے والے

تخیل کی روندی ہوئی وادیوں کو
گل و لالہ و نسترن دینے والے

زمینِ سخن پر ہے احسان تیرا
بیاباں کو رنگِ چمن دینے والے

نئے طرز سے زلفِ شعر و سخن کو
لچک دینے والے شکن دینے والے

تو شاہنشہِ ملکِ شعر و سخن ہے
ہمیں دولتِ فکر و فن دینے والے

گوپال متل

جو شعارِ لب ہے موجِ نو بہارِ نغمہ ہے
خامشی بھی آپ کی آئینہ دارِ نغمہ ہے

گوش اک مدت سے محرومِ سماعت ہے مگر
دل عجب ناداں ہے اب تک اعتبارِ نغمہ ہے

فرق یہ ہے نطق کے سانچے میں ڈھل سکتا نہیں
ورنہ جو آنسو ہے وہ شاہوارِ نغمہ ہے

منکرِ سازِ مسرت ہوں تو کافر ہوں مگر
ہم نفس مضرابِ غم پر انحصارِ نغمہ ہے

اے کہ شکوہ تھا تجھے سنگیں مزاجی کا مری
دیکھ اس پتھر میں بھی موجِ شرارِ نغمہ ہے

دام دین مضطر

نذرِ نیاز

رات دن مجھ کو تماشا چاہیئے — عرش سے تا فرش جلوا چاہیئے
بے طلب دے تو مزا ہے اور بھی — ورنہ ساقی سے تقاضا چاہیئے
میں تو جان و دل سے ہوں تم پہ فدا — تم اگر چاہو تو پھر کیا چاہیئے
دیکھئے آتا ہے کب پیغامِ مرگ — کوئی دن اب اور دیکھا چاہیئے
دیکھنے کی جب کوئی صورت نہ ہو — دیکھنے والوں کو دیکھا چاہیئے
زندگی میں کامیابی کے لئے — اپنی طاقت پر بھروسا چاہیئے
سجدہ کرنا ہے جبینِ شوق کو — تو نہیں تو کوئی تجھ سا چاہیئے
وہ خدا کو بھی جو خاطر میں نہ لائے — بے نیازی اس کی دیکھا چاہیئے
دین و دنیا میں نے سب چھوڑے مگر — مجھ کو تو ہی اک اکیلا چاہیئے
پھول چننے چاہے چن لیکن ترا — خار سے دامن نہ الجھا چاہیئے
پردہ کرنا عشق کی توہین ہے — حسن کو پردہ نہ کرنا چاہیئے

جذبۂ دلِ مضطر فقط کافی نہیں
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے

ڈاکٹر اجمل اجملی

غالب

غالب وہ برگزیدۂ اربابِ افتخار
غالب وہ نازشِ چمنستانِ روزگار
غالب سخن شناس، سخنور، سخن شعار
وہ جس کے ایک شعر پہ سو جنتیں نثار

وہ طنز، وہ خطاب، وہ اشعار، وہ سخن
سانسوں کی وہ نسیم، وہ احساس کی جلن
اُف وہ نگاہِ فن سے نکلتی ہوئی کرن
اللہ رے وہ زورِ طبیعت، وہ بانکپن

جانِ نسیمِ صبح تھا روحِ گلاب تھا
تارے تھے ذرّے ذرّے وہ اک ماہتاب تھا
خوگر ہوا جو درد سے درماں بنا دیا
جو مشکلیں پڑیں انہیں آساں بنا دیا

اشعار کی زباں میں انساں کے تجربات
گلیوں کے پیچ و خم میں نہاں شورشِ حیات
لمحے میں ماہ و سال تو قطرے میں کائنات
بیگانۂ قیود تھے ان کے تخیلات

اس طبعِ پاکباز پہ کیا کیا نہیں پڑی
کوئی خفا ہوا کبھی، روٹھا کبھی کوئی
افلاس، نارسائی و آشفتہ خاطری
یہ زندگی بھی کیسے مزے میں گزار دی

اس آنکھ میں معلّمِ اوّل کا نور تھا
اس کا شعور آدمِ نَو کا شعور تھا
گو وہ ملے تو ساغرِ جم سے غرض نہ تھی
اس کو کسی کے جاہ و حشم سے غرض نہ تھی

ہر چند کہ مشاہدۂ حق کی گفتگو
لیکن نہ چھوٹا ہاتھ سے دامانِ رنگ و بو
پائے بتاں پہ سر جھکا زاہد کے روبرو
پیشِ جنابِ شیخ ہوئی بیعتِ سبو
جامِ شراب اچھال کے تارا بنا دیا
اردو کو اس نے انجمن آرا بنا دیا

پُورن سنگھ ہُنر

نذرِ غالب

دل کو بچاؤں میں کہ سنبھالوں جگر کو میں
الزام کیوں نہ دوں ترے تیرِ نظر کو میں

وہ گھر میں تھے تو گھر کا نظارہ ہی اور تھا
روتا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں

پرواز کی سکت ہے نہ راہِ چمن ہے یاد
قیدِ قفس سے چھوٹ کے جاؤں کدھر کو میں

دیر و حرم میں اہلِ یقین کے واسطے
تیری تلاش کے لئے جاؤں کدھر کو میں

کس کو غرض جو کوئی بنے میرا راہبر
جب راہزن خیال کروں راہبر کو میں

ہر شعر میں ہے طرز اسی جادو طراز کی
پاتا ہوں اس کلام میں رنگِ ہنر کو میں

منوہر لال دِل

سانس گھُٹتی رہی زاری میں بسر ہونے تک
گردِ غم چھائی رہی آنکھ کے تر ہونے تک

شبِ غم نالے نے گھر سر پہ اٹھا رکھا تھا
ایک طوفاں کا عالم تھا سحر ہونے تک

لذتِ دردِ محبت ہمیں معلوم نہ تھی
دل میں پیوست ترا تیرِ نظر ہونے تک

موجۂ بحرِ حوادث کا نہ پوچھو عالم
زیست بیکار رہی ساحل پہ بسر ہونے تک

جان بچ جائے کہیں اب جو اجل آ جائے
جینا دوبھر ہے شبِ غم کی سحر ہونے تک

دھول اڑانے کی بہار اور ہی کچھ ہوتی ہے
ہم نے کی خاک بسر، خاک بسر ہونے تک

شمع جلتی رہی جل جل کے جلانے کے لئے
آ کے جلتے رہے پروانے سحر ہونے تک

غور سے عالمِ ہستی پہ نظر کی ہم نے
اس میں کچھ بھی تو نہ تھا زیر و زبر ہونے تک

شب کو آئے تھے تو کیا آئے تھے اے دل آخر
روٹھے بیٹھے رہے وہ ہم سے سحر ہونے تک

گیانی گُورمُکھ سنگھ مُسافر

غالبؔ

سوچ ڈونگی سرلتا ہے بیان دی — حرف سادے گل گُوڑھی گیان دی
پُہنچ پاندی تیرے سخناں دی زمین — اکھ ڈھک ڈھک ویکھدی اسمان دی
تیری انگل چھو گئی جس ساز نوں — تان چھِڑ پئی اک جہانی شان دی
جوڑیاں تیری کلاکاری دے حرف — نکھر دی تصویر ہے انسان دی
عالمی قدراں دے سُندر گیت کار! — بات تیری بات ہندوستان دی
اُگھڑ دی ایداں مُنکھتا دی قدر — گل نہیں کیول ترے سنمان دی
اے سُچجے کاریگر اک اِٹ دی — بے میچویں نہیں ہے ترے دیوان دی
کاویہ تیرا زندگی وچ زندگی ہے — لوڑ نہیں پر تکھ نوں پروان دی

ہے منا ڈھ مرن بت، پر غلط ہے
غالبؔ سبندھی خبر ہی مر جان دی
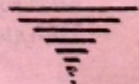
رام کشن تمنّا انبالوی

نذرِ غالب

یہی ہے شغل بس اب جانِ ناتواں کے لئے
فغاں ہے میرے لئے اور میں فغاں کے لئے

دیا ہے دل تو مجھے اپنا درد بھی دے دو
کوئی مکین بھی درکار اس مکاں کے لئے

گری تو آہ! اُسی شاخِ گل پہ برق گری
نہیں تھا ہم نے جسے اپنے آشیاں کیلئے

ضیائے داغ سے ہے نور کا گماں دل پہ
یہی چراغ مناسب تھا اس مکاں کے لئے

ستم سے جتنے وہ سب دعا ہیں تمنّا پہ
رہا نہ شغل کوئی دورِ آسماں کے لئے

حکیم علی احمد نگر عظیم آبادی

نذرِ غالب

دیر و کعبہ ہی میں کیا نورِ خدا ہوتا ہے
جس جگہ دیکھو وہی جلوہ نما ہوتا ہے

دلِ دنیا سے کوئی لاکھ چھپائے لیکن
عیبِ انساں کا کب حق سے چھپا ہوتا ہے

شمع کی لَو پہ نہ جلتے یہ پتنگے ہرگز
کچھ نہ کچھ سوزِ محبت میں مزا ہوتا ہے

کس جفا کش کی یاد آئی خدا خیر کرے
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

دل گرفتہ ہیں مجھ سے تو نہیں ظاہر اے نگر
جس کا کوئی بھی نہیں ہوتا خدا ہوتا ہے

گوہر سیلانی

غالب

اے کہ تُو نے پھونک کر اک رُوح جسمِ لفظ میں
ایک اک حساس دل میں درد پیدا کر دیا

اک مزاجِ نَو عطا کر کے نگارِ نظم کو
شعر کی دُنیا میں تُو نے حشر برپا کر دیا

تُو نے کیا کیا گُل کھلائے ہیں زمینِ شعر میں
آسماں کے ماہ پاروں تک کو رُسوا کر دیا

تیرے ایک اک حرف نے کھولے ہیں اسرارِ حیات
تیرے ایک اک نقش نے دل میں اُجالا کر دیا

نثر لیا اور نظم کیا دونوں پہ قدرت تھی تجھے
کہہ دیا جو اُس کو اُردو نے معلیٰ کر دیا

پردۂ مینا سے اُٹھی تیرے وہ اک موجِ نور
جس نے ہر رنگِ غمِ ہستی کو پھیکا کر دیا

قرض کی پیتا رہا جی کھول کر جب تک رہا
فاقہ مستی نے بھی تجھ کو دل کا دریا کر دیا

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
اللہ اللہ موت کو تُو نے مسیحا کر دیا

دیکھئے اب شاعری کے فن میں کیا کرتے ہیں ہم
تُو نے تو ہر شعر کو اک تحفہ زیبا کر دیا

محمد حنیف کوثر

نذرِ غالب

چھپتا کہاں ہے حسنِ فراواں نقاب میں
سو بے حجابیاں ہیں تمہارے حجاب میں

دل کو سنبھالنا مجھے دشوار ہو گیا
تم یاد آ گئے جو شبِ ماہتاب میں

دیکھے ہیں میں نے عمرِ رواں کے رنگ روپ
لذت گناہ میں ہے ، راحت ثواب میں

سارے جہاں کے درد و الم کو سمیٹ کر
میں نے چھپا لیا دلِ خانہ خراب میں

یوں دسترس میں عشرتِ کونین تھی مگر
تم آ گئے میری نگہِ انتخاب میں

لذت اٹھا رہا ہوں انہیں چھیڑ چھیڑ کر
کتنا خلوص ہوتا ہے اُن کے عتاب میں

کوثر اُسی سوال پہ نادم ہوں آج تک
خاموش ہو گئے تھے وہ جس کے جواب میں

اختر وامق

غزل

چھپ کے روئے گی بہت مجھ کو قضا میرے بعد
زندگی دے گی ہر اک در پہ صدا میرے بعد

اس طرح عام ہوا ، ذکر تباہی کا مری
پھر ترے شہر میں کوئی نہ گیا ، میرے بعد

میرا افسانہ ادھورا تھا ، ادھورا ہی رہا
اُن کو بھی زیست کا عنوان نہ ملا میرے بعد

اُٹھ گیا بزم سے میں حسرتِ تعمیر لئے
میرے خوابوں کا حسیں شہر بسا میرے بعد

مجھ سے اک حرف بھی سن لینا گوارا نہ کیا
میرا افسانہ زمانے سے سنا ، میرے بعد

کون آواز میں آواز ملائے گا بھلا
کس کو دیکھے وہ لبِ ناز صدا میرے بعد

وہ میری کاوشِ ناکام کا حاصل تو نہیں
تیری پلکوں پہ جو اک پھول کھلا ، میرے بعد

میں چلا آیا مگر مجھ کو خبر ہے وامق
ذکر میرا ہی سرِ بزم رہا ، میرے بعد

جوہر بھارتی

دل گنہگارِ التجا نہ ہوا
سازِ منت کشِ صدا نہ ہوا

جب بصارت ہی کھو چکیں آنکھیں
پھر اُجالا ہوا ہوا نہ ہوا

میری قسمت سے کر دیا منسوب
وہ ستارا جو رُو نما نہ ہوا

ہیں وہ مجنوں مُوں جس پہ دنیا کو
سنگ اٹھانے کا حوصلہ نہ ہوا

ہاتھ اٹھے تو تھے دعا کو مگر
نطق شرمندۂ دعا نہ ہوا

زندہ رہنے کے جرم میں دل پر
ہر نفس ایک تازیانہ ہوا

اب کسے راز داں کرے کوئی
آشنا بھی دل آشنا نہ ہوا

جو ہوا تیرے گیسوؤں کا اسیر
پھر وہ تازندگی رہا نہ ہوا

پھر پرسش وہ روز آتے ہیں
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

غمگساری کا فیض ہے جوہر
دل جو غم سے گریز پا نہ ہوا

برج لال کوہلی نازاں سوہدری

کیوں اُن کی ہر اک بات پہ گزرے نہ گماں اور
کل ان کا بیاں اور تھا آج ان کا بیاں اور

اک مائلِ تعمیر ہے اک مائلِ تخریب
کھیتوں کا جواں اور ہے کالج کا جواں اور

ارباب سیاست کی قلابازیاں توبہ
کل ان کا نشاں اور تھا آج ان کا نشاں اور

کیا طرفہ تماشا ہے مرے گلشنِ دل میں
جب آگ بھڑکتی ہے تو اٹھتا ہے دھواں اور

نغمے ہیں وہی نے ہے وہی جو تھی ہے لیکن
آوازِ رباب اور ہے آوازِ فغاں اور

ارمان تو تھا خرمنِ تسکیں کی بقا کا
گو عرصۂ تمنا پہ ہوئے شعلہ فشاں اور

اس وقت بشر کی کوئی مجبوریاں دیکھے
جب دل کے دھڑکنے پہ بھی ہوتا ہے گماں اور

کہنے کو تو ہیں راہ جبیں اور بھی لیکن
اپنا یہ عقیدہ ہے کہاں آپ کہاں اور

اس حرفِ تسلی کا یقیں آئے تو کیوں کر
جب کہتا ہو انسان کا دل اور زباں اور

گو جل گیا لیکن خس و خاشاک ہیں باقی
اک بار نشیمن پہ کرم برقِ تپاں اور

محدود قمر تک نہ رہے کاوشِ انساں
ہیں سینۂ گیتی میں ابھی رازِ نہاں اور

نازاں کی غزل میں بھی ہے اک طرفہ لطافت
ہرچند کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

مرزا محمود بیگ

غالب اور دلّی

حضرت غالب شادی کے دو تین سال بعد تقریباً سولہ سال کی عمر میں دلّی آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ گو خود اس واقعہ کا بیان اس طرح ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"۱۳ برس حوالات میں رہنے کے بعد تاحیات قید با مشقت مقرر ہوگئی - بیوی کی شکل میں بیڑیاں پہنا دی گئیں - دلّی کو جیل قرار دیا گیا اور شعر و سخن کی خدمت مشقت تجویز ہوئی"

دلّی میں رہ کر انہوں نے شعر و سخن کی دنیا کو اس طرح مالا مال کر دیا کہ آج تک استادانِ سخن میں ہی نہیں بلکہ نامیورانِ جہان میں اس کا شمار ہوتا ہے - عمر کے ۵۶ برس جو انہوں نے یہاں گذارے، ان میں مغلوں کے آخری تاجدار بادشاہ بہادر شاہ کی ملازمت اور پھر استادی کی - ۱۸۵۷ء کا انقلاب … عزیزوں کی موت کے سخ اٹھائے - دشمنوں کی پھبتیاں … کے کھائے اور زمانے نے ایک ایک کر کے اپنے ترکش اُن … ئے مگر اس کے باوجود اُن کا دل ایک ایسا جہاں تھا جس میں ایک ہی نقش ہمیشہ نظر نہیں آیا - بلکہ اس میں خوبصورت … نقوش باری باری نمایاں ہیں - اس ساز میں بیٹھا تھے اور ہر نغمہ دل آویز ہے - اُن کے کلام میں سب کچھ ہے - اگر دل لگی اور شوخی و ظرافت کا سامان چاہتے ہیں تو یہاں آفرینی اور خوش گفتاری کی پھلجھڑیاں ہیں - اگر آپ شب کی داستان اور حسن و عشق کے افسانے سننا چاہتے ہیں - … سوز و گداز اور نشہ و مستی کی باتیں ہوں گی جس سے تجربہ … میں بھی جان پڑ جائے گی - اور اگر آپ زندگی کے رازہائے … کی پردہ کشائی چاہتے ہیں تو غالب کی پختہ کاری آپ کو … بلندی پر لے جا کر اس کارگاہِ ہستی کی سیر کرا سکے گی - … اس عالم کون و مکان کی ایک ایک چیز صاف نظر آئے … باوجود اس کے کہ دل میں سکون سے رہنا نصیب نہیں تھا - آگرہ سے آکر کچھ دن شروع میں گلی قاسم جان میں ایک مکان میں اپنی سسرال یعنی نواب الٰہی بخش میں رہے، جہاں اب شفاخانہ طبیہ ہے - اس کے بعد اسی گلی میں ایک مکان خریدا مگر اسے کلکتہ جانے سے پہلے فروخت کر دیا کیونکہ روپے کی ضرورت تھی - کلکتہ سے واپس آکر وہ کھاری باؤلی میں حویلی نواب عبدالرحمٰن میں رہے - کچھ ہی عرصہ بعد جامع مسجد کے پیچھے میں اور وہاں سے اٹھے تو پھاٹک حبش خان میں حویلی مرزا شعبان بیگ میں رہے - یہیں سے شاید ان کو قید میں رہنا پڑا - قید سے چھوٹے تو احاطہ کالے صاحب میں رہے - وہاں سے اٹھے تو بلیماراں میں حکیم محمد حسن خان صاحب کے مکان میں آگئے جہاں ۱۸۵۷ء میں رہے - ابھی ہنگامہ زوروں پر تھا کہ شریف منزل بلیماراں میں حکیم محمود خان صاحب کے مکان میں عارضی طور پر آگئے اور پھر واپس حکیم محمد حسن خان والے مکان میں آگئے - [illegible] میں رامپور کے دوسرے سفر سے واپسی کے بعد مردانہ حصہ کے لئے وہ مکان لیا جو بلیماراں سے گلی قاسم جان میں داخل ہوتے ہی الٹے ہاتھ کو پڑتا ہے - اور [illegible] کی مسجد کے برابر ہے - اسی مکان میں ان کا انتقال ہوا۔

مکان کی مصیبت کے باوجود دلی کے حسن سخن احباب اور استادانِ سخن کی صحبت اور خود اپنی طبیعت کی روانی نے کلام کو ترقی دی - مالی پریشانیوں نے دلی کالج کی ملازمت پر مجبور کیا مگر خودداری پر ملازمت کو قربان کر دیا - انگریزوں کے وظیفہ خوار تھے، دوست تھے، اور درباروں میں شرکت کرتے تھے، قصیدے پڑھتے تھے، خلعت پاتے تھے تسلیم مگر اس کے باوجود صوبے کے سب سے اعلیٰ حاکم سے ملاقات اور کالج کی ملازمت سے انکار - یہ استغنا مرزا صاحب کی خودداری کا ثبوت ہے -

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

۱۸۵۷ء سے پہلے دلّی میں امن چین تھا۔ ادب ترقی پر تھا۔ ادیبوں کی محفلوں سے دلّی ایک مسلسل محفلِ مشاعرہ۔ میاں کالے خان کی حویلی میں ایک دن مرزا غالب، نواب شیفتہ، نواب ضیاء الدین خان، حکیم احسن اللہ خان، مولانا نصیر الدین جمع تھے اور حکیم مومن خان مومن کے انتقال پر سب افسوس کر رہے تھے۔ کسی نے مومن کا ایک شعر پڑھا ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مرزا غالب نے اس شعر کی تعریف کرتے ہوئے کہا "مومن اہلِ دل اور اہلِ نظر تھا۔ مومن کے مرجانے سے زندگی کا لطف آدھا رہ گیا اور میرے بعد......" اتنا کہہ کر رک گئے چنانچہ اسی ردیف میں ان کی ایک غزل بھی تھی۔ احباب نے اصرار کیا تو غالب نے چند شعر سنائے ؎

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد
آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

مگر سیلابِ بلا نے غالب کے بعد کا انتظار نہیں کیا۔ اور تھوڑے عرصے بعد کسی ایک کے گھر پر نہیں بلکہ ساری دلی شہر پر ٹوٹ پڑا۔ بادشاہ کی بادشاہت گئی۔ امیروں کی امیری خاک میں مل گئی۔ دلّی تھی۔ اس کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ جان و مال، ناموس، مکان و مکیں، آسمان و زمین، آثارِ ہستی سراسر لٹ گئے۔

غالب اس دلّی کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں "دلّی نہیں جس میں [illegible] سے مقیم تھا۔ بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار، اردو بازار، خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود قصبہ تھا۔ اب پتہ نہیں کہ کہاں تھے۔"

اپنے دوستوں کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں "میں جس شہر میں رہتا ہوں اس کا نام دلّی ہے اور اس محلہ کا نام بلیماراں کا محلہ ہے لیکن ایک دوست بھی اس جنم کے دوستوں میں نہیں پایا جاتا۔ دہلی بالاخانہ ہے آدمی میں نہیں۔ میر مہدی پر نگاہ کر وہ میر مہدی کہاں گئے۔ وہ میر سرفراز حسین آئے۔ وہ یوسف مرزا گئے۔ وہ میرن گئے۔ وہ یوسف علی خان آئے۔"

دلّی کی اس بربادی کو ایک قطعہ میں یوں بیان کرتے ہیں ؎

اے شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

مگر اسی شمع نے رنج و اندوہ کی آندھیوں میں بجھنا نہیں سیکھا تھا۔ خود بھی روشن رہی اور اپنے گرد مایوسی کا اندھیرا نہ ہونے دیا۔ ۱۵ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو صبح کے وقت چند گورے شہر پناہ کی دیواریں پھاند کر بلیماروں کے محلے میں گھس آئے۔ مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن ان کی ایک نہ چلی۔ لوگوں کے مال و اسباب کو تو گوروں نے ہاتھ نہ لگایا لیکن مرزا صاحب اور ان کے ہمسایوں میں چند آدمیوں کو پکڑ کر لے گئے۔ اور کرنل براؤن کے سامنے پیش کر دیا۔

کرنل براؤن نے ایک سے پوچھا "ول تم کون ہو" اس نے جواب دیا "مسلمان"۔ دوسرے سے پوچھا "ول تم کون ہے" اس نے جواب دیا "مسلمان"۔ غالب سے پوچھا "ول تم ہو" غالب نے جواب دیا "حضور مسلمان۔ مگر آدھا۔ شراب پیتا ہوں اور سور نہیں کھاتا۔ اس لئے آدھا مسلمان"

بات ہنسی میں ٹل گئی اور سب بچ گئے۔ شعر:
رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

اور بھی بلائیں آئیں اور گزر گئیں۔ سال گزرنے لگے اور مرزا صاحب کچھ عمر کی وجہ سے، کچھ پریشانیوں کی وجہ سے اور کچھ بیماریوں کی وجہ سے کمزور اور بوڑھے ہوتے گئے۔ نہ آزاد تھے نہ مقید۔ نہ رنجور نہ تندرست۔ نہ خوش تھے نہ ناخوش۔ اس حالت کو ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

ان مشکلوں کو اپنے اوپر آسان کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ زنان خانے میں چلے گئے۔ بیوی کو ان کی عبادت گزاری کی وجہ سے مولنی کی بہن کہا اور کبھی کہا کہ ان کی نمازوں نے گھر کو [illegible] کی مسجد بنا دیا۔ کبھی عارف کے بیٹے باقر علی مرزا باقر علی خان کی بیوی ——— بچے اور خدا کی کہانی سنا کر ہر چیز چنے کی دال ڈالنے کی وجہ بنائی۔ کبھی حسین علی کو چھیڑ دیا ———

ایک وقت آیا کہ زندگی سے مایوس ہو گئے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"پہلے مقدارِ غذا کی تولوں پر منحصر تھی۔ اب ماشوں پر ہے۔ ہر روز مرگ کا مزہ چکھتا ہے۔ حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں۔ پھر کیوں جیتا ہوں۔ روح اب میرے جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی مجمع پسند نہیں آتا۔ کتاب سے نفرت، آدمی سے نفرت، جو کچھ لکھا ہے بلا مبالغہ بیان واقع ہے۔"

شعر: خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:-

"آگے میں بیٹھے بیٹھے لکھ لیتا تھا۔ اب وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہاتھوں میں رعشہ، آنکھوں میں ضعفِ بصر۔ ناتوانی [illegible] ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا۔ کاہلی، گراں جانی۔ رکاب میں پاؤں نہ باگ پر ہاتھ ہے۔ اپنا مصرعہ پیچھے پیچھے دہراتا ہوں۔

؎ اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

اب مرگِ ناگہاں کہاں رہی۔ اسباب و آثار جمع ہیں۔ ہائے الٰہی بخش معروف کا کیا مصرعہ ہے۔

آؤ جی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں

—— یہ ارمان بھی ایک دن پورا ہو گیا۔ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء دوپہر ڈھلے اس باکمال کا انتقال ہو گیا۔ دلّی دروازے کے باہر نمازِ جنازہ ہوئی۔ سلطان جی چونسٹھ کھمبے کے متصل خاندانِ لوہارو کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ اور دلّی نے جس پر اتنے عرصے فخر کیا اسے ابد آباد تک اپنے سینے سے لگا لیا!

مرزا اسد اللہ خاں غالب

صفحہ ۴۰ سے آگے

دلا کہ کیا پوچھتے ہو تمہارے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ مشغلہ ایسا [illegible] محنت کا ایسا پڑا۔ بالکل لسان الغیب اپنے کو لسان الغیب کہہ کر دس برس پہلے فرمایا تھا۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میاں! ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی مگر میں وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا اور واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا کو سمجھ لیا جائے گا۔ چند شعر

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

•

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی!

•

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

صابر ابوہری

غالب کے شاہکار

تصوف

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلہ کیا

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

فلسفۂ حیات

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ لا دوا پایا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت، دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

پھر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

شوخی

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ضرب الامثال

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی؟ جو جگر کے پار ہوتا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

شراب

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

آگے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

شعر و ادب

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

لطائفِ غالب

مرزا اسد اللہ خاں غالب جہاں فنِ شعر گوئی میں مسلم الثبوت تسلیم کیے گئے ہیں وہاں ان کی بذلہ سنجی، بدیہہ گوئی اور زندہ دلی میں بھی کسی کو کلام نہیں۔ ان کی زندگی میں جا بجا ایسے ادبی لطائف نظر پڑتے ہیں کہ سن کر ایک دفعہ تو مردہ انسان کی زبان سے بے اختیار واہ واہ کی صدا بلند ہوتی ہے۔

آپ سودائی ہیں

ایک صحبت میں مرزا غالب میر تقی کی تعریف کر رہے تھے اور ان کے کلام کے محاسن بیان کر رہے تھے۔ حسنِ اتفاق سے شیخ ابراہیم ذوق بھی اس مجلس میں تشریف رکھتے تھے۔ انہوں نے کہا۔ نہیں مرزا صاحب سوداؔ کو میرؔ پر ہر طرح ترجیح ہے۔ مرزا بولے میں تو آپ کو میری سمجھتا تھا۔ اب راز کھلا کہ آپ تو سودائی ہیں۔

شراب کی عظمت

شراب کے متعلق ان کی ظرافت آمیز باتیں بہت مشہور ہیں۔ ایک شخص نے ان کے سامنے شراب کی نجاست مذمت کی۔ اور یہ دلیل پیش کی کہ شراب خور کی دعا درگاہِ الٰہی میں قبول نہیں ہوتی۔ مرزا بولے بھئی جس کو شراب میسر ہے اس کو اور کیا چاہیے جس کے لئے وہ درگاہِ الٰہی میں ہاتھ پھیلاتا پھرے۔

شیطان کی کوٹھری

مرزا کے مکان میں ایک تنگ و تاریک کمرہ تھا۔ جس کا دروازہ اس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں بہت جھک کر جانا پڑتا تھا۔ مرزا ہمیشہ اسی کمرے میں بیٹھا کرتے تھے۔ ایک دن جبکہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا۔ مولانا آزردہ دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے آئے۔ مرزا صاحب اسی کمرے میں ایک دوست کے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے۔ مرزا کو رمضان کے مہینے میں شطرنج کھیلتے دیکھ کر مولانا نے کہا۔ ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے مگر آج اس حدیث کی صحت پر تردد پیدا ہو گیا ہے۔ مرزا نے کہا۔ قبلہ حدیث بالکل صحیح ہے۔ مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری تو ہے۔

خدا کو سونپا

جب نواب یوسف علی خاں والئی رام پور کا انتقال ہو گیا تو مرزا صاحب بھی تعزیت کے لئے رام پور تشریف لے گئے۔ ان کے بعد نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے۔ اس زمانے میں نواب کلب علی خاں لیفٹیننٹ گورنر سے ملنے کے لئے بریلی جا رہے تھے۔ ان کی روانگی کے وقت مرزا بھی موجود تھے۔ چلتے وقت نواب صاحب نے رسماً کہا کہ اچھا مرزا صاحب! خدا کو سونپا۔ مرزا صاحب نے سر پیٹ لیا اور کہا کہ حضور غضب ہو گیا۔ پوچھا کیوں؟ مرزا نے کہا کہ خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا تھا پھر اب آپ خدا کے سپرد کرتے ہیں۔

آدھا مسلمان

مرزا غالب کرنل براؤن سے ملنے گئے تو وہی کلاہ پاپاخ جو پہنا کرتے تھے ان کے سر پر تھی۔ جس کی وجہ سے ایک عجیب وضع قطع معلوم ہوتی تھی۔ کرنل نے انہیں دیکھ کر کہا: "کہ مرزا صاحب آپ مسلمان ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا: "حضور آدھا مسلمان ہوں"

کرنل صاحب نے یہ سن کر حیرت سے پوچھا کیا بات، آدھا مسلمان کیا؟

انہوں نے جواب دیا: "حضور! دعا یوں کر خراب پیتا ہوں، سو
نہیں کھاتا۔"

ایک نہیں رکھا

رمضان شریف ختم ہونے کے بعد ایک مرتبہ مرزا صاحب قلعہ
میں گئے تو بادشاہ نے پوچھا: "کہئے مرزا صاحب آپ نے کتنے
روزے رکھے؟"

مرزا نے جواب دیا کہ "پیر و مرشد! ایک نہیں رکھا۔"

گدھے نہیں کھاتے

حکیم رضی الدین مرحوم جو دہلی کے ایک نہایت نامی گرامی طبیب
تھے۔ مرزا کے بڑے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ مگر اتفاق کی
بات کہ ان کو آم مرغوب نہیں تھے۔ ایک دن مرزا صاحب کے
یہاں پہنچے ہوئے تھے۔ مرزا جی کے پاس بیٹھے تھے۔ آموں کا زمانہ
تھا۔ وہاں برآمدے کے سامنے آموں کے کچھ چھلکے پڑے تھے۔ ایک
گدھے والا ادھر سے اپنے گدھے لئے ہوئے گزرا۔ گدھے نے آم کے
چھلکے سونگھے اور چھوڑ دیئے۔ کھائے نہیں۔ حکیم صاحب نے فرمایا
کہ "دیکھو مرزا تم آموں کی بڑی تعریف کرتے ہو۔ آم ایسی
چیز ہے کہ اسے گدھے بھی نہیں کھاتے۔"

مرزا نے جواب دیا: "جی ہاں! بے شک گدھے آم نہیں کھاتے۔"

حساب برابر ہوا

کبھی کبھی جب مرزا بیٹھے ہوتے تھے اور بے تکلف دوستوں
یا شاگردوں کا مجمع ہوتا تھا۔ تو ایسی بے تکلفانہ باتیں کرتے تھے
کہ لطف آجاتا تھا۔

ایک دن مرزا بیٹھے ہوئے پلنگ پر دراز تھے۔ اتنے میں
میر مہدی مجروح آپہنچے اور مرزا کے پاؤں دابنے لگے۔ مرزا نے کہا
"ارے بھئی تو سید زادہ ہے، کیوں میرے پاؤں دابتا ہے۔ مجھے کیوں
گنہگار کرتا ہے۔" مگر جوش عقیدت خلوص اور اعتقاد کی
زیادتی میں کون سنتا ہے۔ مجروح نے ملاحظہ نہ کیا اور پاؤں
دابتے رہے۔ جب مرزا نے بہت اصرار کیا تو بولے: "قبلہ و کعبہ
آپ گھبراتے کیوں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ آپ اجرت دے
دیجئے گا۔" مرزا نے کہا: "خیر یہاں تک کوئی مضائقہ نہیں ہے۔"
پاؤں داب چکے تو میر مہدی بولے: "دیجئے حضرت
[illegible]"

مرزا بولے: "واہ بھئی واہ۔ اماں اجرت کیسی۔ تم نے میرے
پاؤں دابے میں نے تمہاری اجرت داب لی۔ دونوں برابر ہو گئے۔"

خدا کھانا دے گا

ایک بار انہیں جتنی رقم ملی۔ اس کی شراب خرید لی۔ جب
وہ گھر پہنچے تو بیوی ناراض ہوئی کہ گھر میں کھانے کو اناج کا [دانہ]
نہیں اور میاں ساری رقم شراب پر خرچ کر دی گئی ہے۔" غالب
فوراً بولے: "قرآن شریف میں خدا نے ہر کسی کو کھانا دینے کا [وعدہ]
کیا ہے۔ لیکن شراب کا نہیں۔ لہٰذا میں نے شراب خرید لی ہے
مجھے کھانا دے گا۔"

بھوتوں کا ڈیرہ

غالب کو بھوتوں اور توہمات سے بڑا بیر تھا۔ ایک بار
انہوں نے مکان بدلنے کا پلان بنایا۔ جب وہ مکان دیکھ کے
اپنی بیوی کے ساتھ واپس آئے تو بیوی نے کہا: "اور تو سب
ٹھیک ہے مگر لوگ کہتے ہیں کہ یہ گھر بھوتوں کا ڈیرہ ہے۔"
پر غالب فوراً بولے: "تم سے بڑا بھوت بھی کوئی ہے جو
سکتا ہے۔"

خدا حافظ

ایک بار غالب نے اپنے کسی دوست کو شراب پیش کی
جس پر اس نے کہا۔ "خدا حافظ۔" غالب نے جواب دیا: "میں نے
اس خیال سے نہیں دی ہے کہ تم خود اس کی حفاظت کرو
اور تم ہو کہ اسے خدا کی تحویل و نگرانی میں دے رہے ہو۔"

دانے دانے پر مہر

غالب کو بادشاہ ظفر سے بڑی عقیدت تھی۔ ایک مدت تک انہوں نے ان کی خدمت گزاری کی۔ اور اعزاز پایا۔ ایک
[دن] وہ دونوں لال قلعہ کے باغ میں ٹہلتے ٹہلتے آگے نکل گئے۔ پکے
ہوئے آم دیکھ کر غالب کی نگاہیں وہیں آم کے درخت پر مرکوز
ہو گئیں۔ بادشاہ کے استفسار پر انہوں نے کہا: "داناؤں کا قول
ہے کہ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ کسی آم
پر میرا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔" اسی شام غالب کو شاہی باغ
کے آموں کا ایک پارسل بھجوا دیا گیا۔

گورے کے بعد کالے کی قید میں

ایک بار غالب کو ایک جھوٹی شکایت کی بنا پر جیل میں بند کر
دیا گیا۔ رہائی کے بعد وہ اپنے دوست کالے خاں کے پاس چلے گئے
جب کسی بہی خواہ کو ان کی رہائی کا علم ہوا تو وہ مبارکباد دینے
چلا گیا۔ اس پر غالب نے کہا: "کیا میں رہا ہو گیا ہوں؟ پہلے میں
[گورے] کی قید میں تھا اور اب کالے (کالے خاں) کی قید میں ہوں۔"

مونث بھی مذکر بھی

ایک موقع پر بحث چھڑ گئی کہ رتھ مذکر ہے یا مونث۔ جب
[بحث] ختم ہونے پر ہی کو نہ آئی تو غالب نے فوراً کہا: "اگر رتھ کو
[چلانے] والی کوئی عورت ہو تو مونث ہے اگر مرد رتھ بان ہو تو اس
حالت میں مذکر ہے۔"

قرض کی پیتے تھے

ایک مرتبہ مرزا غالب کے قرضخواہ نے ان پر مقدمہ کر دیا۔ کچھ
جواب دہی کے لئے مرزا صاحب عدالت میں طلب کر لئے گئے۔ جب
مرزا صاحب مفتی صدر الدین آزردہ صدر الصدور دہلی کے روبرو پیش
ہوئے تو استغاثہ کے جواب میں انہوں نے یہ شعر پڑھا:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مفتی صاحب شعر سن کر پھڑک گئے مگر مرزا صاحب کے خلاف
ڈگری بھی دے دی۔ اور مدعی قرضخواہ کو اپنی جیب سے مرزا
کا قرضہ بھی ادا کر دیا۔

دھوکے میں نجات

ایک مرتبہ ایک صاحب بھوپال سے دلی سیر و تفریح کیلئے
آئے۔ ایک دن مرزا غالب سے ملنے ان کے مکان پر آ گئے۔ مرزا
ان سے خوش خلقی سے ملے لیکن جس وقت وہ ملنے گئے تھے وہ مرزا
کے شغل مے و جام کا وقت تھا۔ لہٰذا حسب معمول شراب کا شیشہ
و گلاس سامنے رکھا تھا۔ ان صاحب کو خبر نہ تھی کہ مرزا صاحب
کو یہ شوق بھی ہے۔ اتفاقاً شراب کے شیشہ کو انہوں نے ہاتھ میں
اٹھا لیا تو کسی نے کہا: "جناب یہ شراب ہے۔"

تو بھوپالی صاحب نے جھٹ شیشہ ہاتھ سے رکھ دیا اور
فرمانے لگے: "میں نے تو اسے شربت کے دھوکے میں اٹھا لیا تھا۔"
مرزا صاحب نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور کہا: "زہے
نصیب! دھوکے میں نجات ہو گئی۔"

شراب اور جاڑہ

ایک مرتبہ جاڑے کے موسم میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ
مرزا غالب کے مکان پر ان سے ملنے کے لئے آئے۔ مرزا صاحب
شغل مے نوشی میں لگے ہوئے تھے۔ نواب صاحب کو دیکھ کر
ان کی طرف مرزا صاحب نے شراب کا گلاس بڑھا دیا اور کہا لیجئے
نا! نواب شیفتہ خاموشی سے دیکھتے رہے۔

مرزا صاحب نے پھر خود ہی سکوت توڑتے ہوئے کہا کیا
حضرت جاڑے میں بھی نہیں پیتے؟

شراب نہ پی ہو تو کافر

ہنگامۂ غدر کے بعد جب مرزا غالب کی پنشن بند تھی۔ اور
پھر جب دربار میں شریک ہونے کی اجازت ہوتی تھی۔ انہی دنوں
پنڈت موتی لال میر منشی [illegible] مرزا صاحب سے ملنے آئے۔ اتفاقاً
کچھ تذکرہ پنشن کا چلا تو مرزا صاحب نے کہا۔

"تمام عمر میں اگر ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک
دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار۔ پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے کس
طرح مجھے مسلمانوں میں شمار کیا۔"

بی۔ ڈی صابر ایم۔ اے

غالب

مرزا اسد اللہ غالب صرف غالب ہی نہیں بلکہ عالمگیر غالب کہہ سکتے ہیں۔ وہ تمام دنیا پر غالب ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل مرزا غالب کی صد سالہ برسی بڑی شان و شوکت سے بین الاقوامی سطح پر نہ صرف ہندوستان و پاکستان میں بلکہ تمام دنیا میں مختلف ذریعوں سے منائی جا رہی ہے۔

بقول بجنوری مرحوم کونسا نغمہ ہے جو اس ساز میں موجود نہیں ہے۔ اردو شاعری کی دنیا میں غالب کو جو مقام حاصل ہے اس کی عظمتوں کا اعتراف کرنا اور اسکی شاعری کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا تنقیدی شعور کی ایک مسلسل کوشش رہی ہے۔ غالب کی شاعری ایک شدید اندرونی کشمکش اور تصادم کی پیداوار ہے اسی لئے اس کے ایک سے زیادہ رنگ ہیں۔ جوں جوں زمانہ گذرتا جائے گا اس میں اور رنگوں کا اضافہ ہوگا۔ ایک گرہ کھلے گی تو سو گرہیں اور پیدا ہوں گی۔ ایک آئینے کے بعد دوسرا آئینہ ایک تعبیر کے بعد دوسری تعبیر اور ایک پردے کے پیچھے سینکڑوں پردے نظر آئیں گے۔ غالب نے ان پردوں پر اپنی روح کو بے نقاب کیا ہے۔

غالب اردو شاعری میں ایک نادر مظہر ہیں اُن کی انفرادیت اور عظمت اتنے متضاد پہلوؤں میں اُجاگر ہوئی ہے کہ ان سب کا احاطہ کسی ایک شخص کے کسی ایک مضمون کی محدود بساط میں کرنا مشکل ہے۔ فکر و سخن کی محفل میں ان کا مقام اور منصب سب سے الگ ہی نہیں سب سے نمایاں اور بلندی بھی ہے غالب کی شاعری کا موضوع اُن کی شدید قسم کے ذاتی تاثرات ہیں۔ اُن کی امتیازی خصوصیت ان کا تفکر یعنی ان تاثرات پر اُن کے بے چین اور عمیق ذہن کا ردِ عمل ہے۔

تخییل و جذبات کی ترتیب کا مظہر شاعری ہی ہو سکتا ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے وہ جذبات کی بدولت ہے۔

شاعری کیا ہے۔ دلی جذبات کا اظہار ہے۔

مرزا غالب کی شاعرانہ شخصیت کسی تعریف و تعا[رف] کی محتاج نہیں۔ ان کی شاعری کی اہمیت کے اسبا[ب] ظاہر ہیں۔ ان کے خیالات میں گہرائی۔ جذبات میں خلوص اور اظہار میں کیفیت۔ زندگی کے مخصوص پہلو[ؤں] کی زیادہ معتقدی کی ہے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی اور ا[س] ماحول کے کئی بڑے بڑے طوفانوں سے گذرے [تھے]۔ غالب کے زمانے میں دہلی کی آخری بہار تھی۔ بہت [سے] لوگ صرف بہار کو دیکھتے رہے غالب کی نگاہوں [میں] کچھ اور بہاریں بھی تھیں۔ اُن کے اندر اُس نظام [سے] وفاداری کا جذبہ پیدا نہ ہو سکا۔ ان کا باغیا[نہ] ... ایک مجبور اور معذور درباری کی ذہنیت نہ پیدا [ہو] سکا۔ بہادر شاہ ظفر کبھی اُن سے اس طرح خوش [ن]ہ رہے جس طرح ذوق سے۔ وہ کسی دربار سے وابستہ نہ ہو سکے۔ دربار سے فائدہ اٹھانے میں اُنہیں پیش نہ تھا۔ شاہی کے اس آخری دور میں وہ [بھی] انفرادیت پرست تھے۔ اور انفرادیت پرستی کا دور جو سرمایہ داری میں فروغ پاتا ہے ابھی دور تھا

شاہی کے اس دور کو باقی رکھنے کے لئے جس مذہبی جذبے کی مدد مل جاتی تھی۔ غالب وہ مدد نہ دے سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تمام عمر دل کی لگی میں کٹی۔ غالب نے زندگی کے ہر پہلو کا ہر نقطہ نگاہ سے مطالعہ کیا۔ ان کی شاعری میں تمام عناصر کم و بیش پائے جاتے ہیں جو زندگی کے دائرے میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً شکایت زمانہ اخلاق۔ خودداری۔ تصوف۔ فلسفہ عشق و محبت رندی و زہد۔ ناز و نیاز۔ سوز و گداز۔ دردِ محبت۔ یاس و اُمید۔ رشک و حسرت۔ آہ و فغاں اور قنوطیت ہیں۔ ہستی اور نیستی کی کش مکش میں پڑے رہتے تھے۔ دل کی لگی تو ہر وقت کا معاملہ تھا۔ مگر دل لگی اُن کی زندگی میں شاذ و نادر ہی آئی تھی۔ تمام عمر مصیبتوں میں کٹی۔ نامرادی کی مستقل زنجیر دل و دماغ پر چھائی رہتی تھی۔ بیوی کی موجودگی کو اسیری سمجھتے تھے۔ کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی تھی۔ جب ہر خواہش پر دم نکلے تو سوائے خدا سے شکایت اور زمانے کی رواداری پر ہی قناعت کرنا پڑا۔ اس زندگی کو خوشحال نہ بنا سکے۔ کوئی اولاد زندہ نہ رہی۔ "متبنیٰ بنایا وہ بھی داغِ مفارقت دے گیا۔ اس عالم میں ایک شاعر کے جذبات جو ہو سکتے ہیں۔ وہ مرزا غالب جیسے مجتہد و صاحب طرز کی زبان سے کہے جا سکتے ہیں۔ موزوں اوزان کی کتابیں پڑھکر شاعری کی مہارت حاصل کر لینا اور رواج کو برت بنا کر دنیا سے اپنی استادی کا سکہ منوا لینا اور بات ہے لیکن اپنی ذہنی انفرادیت کے اظہار کے لئے کرب کی اس کٹھن راہ سے گذرنا جہاں پہنچ کر قدم قدم پر خود اپنے نقوش کے نامکمل اور ادھورے ہونے کا احساس ہو واقعی وہ دُر دُرے جس کی تلملاہٹ زندگی کے آخری لمحوں تک نہیں جاتی۔ غالب کی شاعری کا یہ انسان پیچ ایک نقش فریادی ہے۔ دیوان غالب کے پہلے ہی شعر پر غور کریں ۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

شعر کا اصطلاحی مطلب یہ ہے کہ ایران میں رواج تھا کہ فریادی کاغذی لباس پہن کر بادشاہ کے دربار میں آتے تھے اور یہ لباس اس بات کی علامت سمجھا جاتا تھا کہ ایک فریادی فریاد لیکر آیا ہے مگر میرے نزدیک غالب کے اس شعر کا مطلب اور ہے کہ یہ دنیا ایک کاغذی پیرہن پہنے ہوئے ہے یعنی ہستی کو ناپائداری اور دامِ خیال سمجھا جائے۔ یہ ہستی ہستی نہیں بلکہ زندگی موجب رنج و ملال و آزار کاغذی پیرہن کی طرح عارضی ہے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یعنی انسان اپنی اصل ہستی سے جدا ہو کر عارضی اور فانی دنیا سے ملحق ہو گیا۔

غالب کے یہاں زندگی کے جبر و قہر اور انسان کی مجبوری و معذوری کا جو تذکرہ ہے اُسی بنا پر غالب کو لوگ قنوطی کہتے ہیں مگر یہ نہیں اُس نے زندگی کے جبر و قہر کا احساس رکھتے ہوئے بھی انسان کی عظمت کا ترانہ گایا ہے جس پر برسوں مہر و مہ کی آنکھیں لگی رہی ہیں جو خاک کے پردے سے نکلتا ہے۔ جب فلک برسوں گردشیں کر لیتا ہے تو گرمِ سخن ہوتا ہے۔ اس کے گرد ایک خلق ہے کہ جس کی خاموشی میں بھی ایک عالم نکلتا ہے وہی غالب کا ہیرو ہے۔ غالب اسی ہستی رجائیت سے بلند ہے جو اپنے خواب و خیال کی مستی کی وجہ سے سنگین حقائق کا احساس نہیں رکھتی انہیں زندگی کی سنگین اور دلسوز حقیقتوں کا پورا احساس تھا۔ زندگی ان کے نزدیک گہری اور عظیم شے ہے۔ اور انسان زندگی کے صحرا میں اُس قطرۂ شبنم کی طرح ہے جو خار و بیابان پر ٹپکا ہوا ہے۔ غالب کی شاعری میں قطرۂ شبنم اور خار و بیابان دونوں کا احساس ملتا ہے۔ انسان اور کائنات کی خلقت اور اس کے آغاز و انجام کے متعلق حکیمانہ ارشادات ملتے ہیں جو جرم کو خرابی کی وہ صورت تو محسوس کروا دیتے ہیں جو روزِ اول سے ہے

تعبیر میں مضمر ہے۔ اُن کی آوازیں وہ بلیغ عارفانہ پندار اور حکیمانہ انداز سے بے نیازی نہیں ہے۔ غالب کی شاعری ناکامی محبت اور محرومی کا سارا احساس لئے ہوئے بھی ہمارے لئے زندگی کی ایک بشارت ہے۔ اپنی شوخ طبعی سے سنگین لمحوں سے گذر جاتے ہیں۔

غالب بہرحال اپنے دور کی پیداوار ہیں لیکن ان کی شاعری کی اپیل آفاقی ہے اور ذہن انسانی کے ایسے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھاتے ہیں جو ہر دور کیلئے موجب کشش ہیں۔ زندگی ایک پل صراط کی طرح ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز میر کے یہاں عاشقی قدر اعلےٰ ہے۔ غالب کے یہاں زندگی کیونکہ غالب نے قدیم نظام و اخلاق سے بلند ہوکر زندگی کی عظمت کو واضح کیا ہے۔ اقبال کے یہاں آکر صرف زندگی ہی نہیں بلکہ باعمل زندگی قدر اعلےٰ بن جاتی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اگر غالب نہ ہوتے تو اقبال بھی نہ ہوتے۔ غالب نے سماجی زندگی کو ہاتھ نہیں لگایا لیکن اس شخصیت کے اندر کی دنیا کتنی بڑی عظیم اور کتنی دائمی قدروں کی حامل ہے اور کتنی عالمگیر انفرادیت رکھتی ہے اسکا اندازہ ہمیں غالب کی شاعری کے لب و لہجہ سے ہوتا ہے جس کے اشعار پکار پکار کر یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ ہمیں ایک بڑی شخصیت نے جنم دیا ہے۔

غالب کے بکھرے ہوئے آنسوؤں میں ہمیں بحر حیات کی وسعتوں اور گہرائیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ غالب کی آہ و فغاں میں بہشتی جنت کی ہواؤں کی سنسناہٹ ہے۔ غالب جب اپنے دل پر ہاتھ رکھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انسانیت کے دل پر ہاتھ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب عالمگیر غالب ہو گیا ہے۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

مگر یہ شعر غالب پر صادق نہ تھا۔ خدا نے اُس کو رسوا ہونے کی بجائے مقبول عام کر دیا۔ مندرجہ ذیل اشعار مرزا غالب کی غزلوں کے بڑے بڑے عناصر پیش کرتے ہیں۔

فلسفۂ عشق و محبت:۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

عالم یاس:۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

سوز و گداز:۔

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

رندانہ:۔

جب مے کدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

غیرت و خودداری:۔

مانا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

صابرہ

غالب کے تکیوں پر لکھے ہوئے اشعار

تھا خواب میں پچھان کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

رات کے وقت مے پئے ہاتھ میں اک چھری لئے
آئے وہ یاں قضا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں

ذوق آگیا ہے گھر میں چرا لے گا سب کلام
اٹھئے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

جب کہ گھر میں بس ایک چھپر ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

میں کس طرح سے سوؤں کہ کل رات آٹھ چور
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

یہ ترے مہندی رچے ہاتھ کتنے پیارے ہیں
اری حسینہ ذرا میرے پاؤں داب تو دے

بیگم! ہمیں رلایا تو تم ڈوب جاؤ گی
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

نان اُس کی ہے کباب اُس کے ہیں راتیں اُس کی ہیں
تیری بیگمیں جس کے گھر شب کو غزل خواں ہو گئیں

لیٹے ہوئے ہیں ہم ذرا بھر لائیو چلم
مدت ہوئی ہے حقۂ جاناں پئے ہوئے

بیگم غالب کے تکیوں پر لکھے ہوئے اشعار

نیند تم کو تو خوب آتی ہے
پر ہمیں رات بھر نہیں آتی

ذوق کا ڈر تھا بہت یہ ذوق ہے
صبح سے پہلے جگا رے گا ہمیں

دھول دھپا مجھ پہ سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
تم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن

ڈومنی نے کیا نکما کر دیا
ورنہ غالب آدمی تھے کام کے

پیٹنے کی اے دل اور ہی ترکیب کر کہ میں
شایان دست و بازوئے غالب نہیں رہی

دور سے سوتن کے خراٹوں کی آتی ہے صدا
آج پھٹ جائیں گے میرے کان [illegible]

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت یا رب
جس کی قسمت میں ہو غالب کا گریباں ہونا

میری ہی آہوں سے کل شب میری ساڑھی جل گئی
جب بجھانے آئے غالب ان کی داڑھی جل گئی

نشے میں تم کو غالب شب کو اکثر پیٹ دیتے ہیں
خدا رکھے بہت سی خوبیاں ہیں [illegible]

راجہ مہدی علی خان

سردار گورنام سنگھ چیف منسٹر پنجاب (دائیں) نے پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی ڈیپارٹمنٹ کے ۔۔۔ میں غالب کی تصویر کی نقاب کشائی کی۔
ان کے ۔۔۔ کھڑے ہیں۔ اور مستان الاعجاز راج کوی پنڈت میلا رام وفا چیف ایڈیٹر جان نثار اختر (بائیں طرف)

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب — جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

خواجہ مہدی علی خاں

غالب ایک ریسٹوران میں

(ایک اینگلو انڈین حسینہ کے ساتھ)

۱

ہے کمال پہ اسس تل کے سوا ایک نشاں اور
تم کچھ بھی کہو، ہم کو گزرتا ہے گماں اور
تم کہتی ہو "انگلش میں محبت کا کروایت"
آتی نہیں اردو کے سوا مجھ کو زباں اور
سعدی کی زباں تپی میں کچھ ارشاد کروں میں
ڈر ہے کہ یہ گزرے نہ کہیں تجھ پہ گراں اور
یارب یہ نہ سمجھی ہے نہ سمجھے گی مری بات
ملک اور دے اس کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

۲

کب سے ہم ادھر بیٹھا ہے اے بوائے ادھر آؤ
قیمہ کے سوا کچھ بھی ہے کوئی "چیز" یہاں اور؟
لے آؤ وہ تکے جلدی سے اب ورنہ پیشن تو
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور
گر حکم ہو میڈم تو ابھی منگواؤں مٹن چاپس
کہہ دینا اگر چاہیے "دل" اور "زباں" اور
"دل اور زباں" کر لا فدائی اسے بیرا!
دل اور دے اس کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
مرتا ہوں اس آواز پہ ہی کتنا ہی بڑھ جائے
تو بوائے سے لیکن یہ کہے جائے کہ ہاں اور

۳

تانگہ بھی مرے پاس ہے تم تم بھی مرے پاس
ہوٹل کے علاوہ تجھے لے جاؤں کہاں اور
پاتے نہیں جب راہ تو رک جاتے ہیں تانگے
آت دیکھ کے پبلک تجھے ہوتی ہے رواں اور
کانوں کو لگاتا ہوں تو آ جاتے ہیں گوڑے
تم ہو تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

۴

تانگوں پہ ہیں کوڑوں کے نشاں پیٹھ پہ پھیلے
ہر روز دکھاتی ہے تو اک داغ نہاں اور
تو بھاگ گئی سیج سے گر ہاتھ چھڑا کر
لے آئیں گے بازار سے اک حور جناں اور
اے جان تمنا تجھے اک دوں گا میں گھونسہ
ہنگام شب وصل جو کی آہ و فغاں اور

راشٹرپتا مہاتما گاندھی۔ جن کا صد سالہ جنم دن دیش بھر میں منایا جارہا ہے

وفا راشدی

غالب کا اندازِ بیان

علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اور اُن کی شاعرانہ عظمت اور ہمہ گیر شخصیت کا اعتراف اس شعر میں کیا ہے۔

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

احباب پر سب لفظ دانِ سخن متفق ہیں۔ کہ غالب کی پرواز تخیل کو کوئی شاعر نہیں پہنچا۔ لیکن جس چیز نے غالب کو شہرتِ دوام عطا کی اور اُن کی شخصیت کو حیاتِ جاودانی بخشی۔ وہ ان کا اندازِ بیان ہے۔ اس امر کا خود غالب کو بھی احساس تھا کہ اس کا اظہار بار بار انہوں نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔ کہتے ہیں ؂

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

اکثر شعرا نے مقطعوں میں اپنے کمالِ فن اور خوبیٔ سخن کی طرف اشارے کئے ہیں۔ اسی قسم کا ایک شعر داغ کا ذہن میں ابھرتا ہے ؂

نہیں ملتا کسی مضمون سے ہمارا مضموں
طرزِ اپنا ہے جدا سب سے جدا کہتے ہیں

یہاں غالب کا داغ سے یا کسی اور شاعر سے تقابلی مطالعہ مقصود نہیں۔ بلکہ یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ اُردو میں اور بھی بہت سے اچھے شاعر ہیں۔ لیکن غالب کا اندازِ بیان سب سے الگ۔ سب سے جدا گانہ ہے۔ آج کی صحبت میں اسی موضوع پر گفتگو کی جائے گی۔

اُردو شاعری وَلی۔ میر۔ سودا اور درد کے زمانے سے ایک ڈگر پر چلی آتی تھی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ رنگینیاں بڑھتی گئیں۔ مضامین و خیالات میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ اُردو کا دامن کھلتا رہا۔ رنگا رنگ اور گوہرِ گرانمایہ سے مالامال ہوتا گیا۔ خاندانِ مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کا عہد اُردو شاعری کے لئے آئینہ دورِ درخشاں ثابت ہوا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ذوق۔ مومن اور غالب نے اپنے اچھے فکر و خیال کے ناؤس سے ساری محفلِ سخن کو جگمگا رکھا تھا۔ غالب نے قلعۂ معلّٰی میں بیٹھ کر ایک نئی آواز بلند کی۔ ایک نئی راہ نکالی۔ اور شعر و سخن کی ایک ایسی مشعل روشن کی جس نے مستقبل میں ہر آنے والے کاروانِ سخن کے لئے جادۂ منزل کی نشاندہی کی۔ اُنہوں نے قدما کی روایات کے خلاف بغاوت کی۔ اُردو شاعری ہی نہیں اُردو زبان میں بھی ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈالی۔ اور بقول آل احمد سرور "اُردو غزل میں غالب ایک نیا خیال، نیا گوشۂ فکر، ایک نیا ذہن اور ایک نیا فلسفہ لائے ہیں"۔ یہ غالب ہی کا اندازِ بیان کا معجزۂ فن تھا کہ اُردو شاعری کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ اعجازِ شعر ان کے اندازِ بیان کا مرہونِ منت ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور ایک اور جگہ رقمطراز ہیں۔

"غالب کے فکر و شاعری کی بنیاد جدت طرازی پر ہے۔ اور اس جدت طرازی میں جدتِ تخیل، جدتِ طرزِ ادا، جدتِ استعارات و تشبیہات، جدتِ محاکات اور جدت ادا سب محاسنِ شعری میں آ جاتے ہیں"۔

ایک سرور پر ہی اکتفا کیا ہے دوسرے نقاد بھی غالب کے اندازِ بیان کے معترف ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسی نے غالب کے اندازِ بیان کو جدت طرازی کسی نے طرزِ ادا کسی نے جدتِ ادا اور کسی نے اسلوبِ بیان کا نام دیا ہے۔ اور خود غالب نے بھی ادائے خاص سے نکتہ سرا ہونے پر فخر کیا ہے۔ ؂

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

امعانِ نظر و تفکر سے جس بات کو اندازِ بیان سے منسوب کیا ہے وہ دراصل غالب کی وہ جدت طرازی ہے جو زبان و بیان ترکیب، خیال، محاکاتِ معنی، تشبیہات و استعارات غرضیکہ تمام لوازمِ شعری کو ایک ادائے خاص سے شاعری میں سمو دی گئی ہے۔ مرزا کے کلام میں کیا نہیں، بلاغت، فصاحت، اختصار، جدتِ خیال کے ساتھ ساتھ لطافتِ زبان اور شگفتگیٔ کلام سب کچھ ہے۔ حیات و کائنات کے تجربات و مشاہدات حسن و عشق کی رنگینیاں و رعنائیاں اور فطرت کی گہرائیاں اُن کی غزل میں پورے تنوع و توانائی کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔

غالب نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ـــــ انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کیا۔ تخیل میں تنوع اور مضامین میں وسعت پیدا کی۔ اُردو غزل کو ایک نیا اسلوب دیا۔ اُردو زبان کو ایک نئے آہنگ سے آشنا کیا ؂

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

غالب نے زندگی کو فقط دیکھا نہیں محض اپنایا نہیں بلکہ اسے برتا بھی ہے۔ وہ زندگی کی مسرتوں اور نعمتوں سے بھی لطف اندوز ہوئے۔ اور اس کی محرومیوں اور صعوبتوں سے بھی دوچار رہے۔ ان کے نزدیک زندگی ایک شمع کی مانند ہے۔ جسے صبح ہونے تک جلنا ہے یا طوفان، جلتے رہنا ضروری ہے۔ ؂

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غمِ ہستی کا یہ احساس، حیات و موت کی یہ حقیقت پہلی بار ہمیں غالب کی غزل میں نظر آتی ہے۔ اُنہوں نے جس طرزِ خاص سے عملی زندگی کی طرف لطیف اشارہ کیا ہے اس کی مثال اس سے پہلے کسی اردو غزل گو شاعر کے ہاں نہیں ملتی۔ اگر انسان کے لئے موت لازمی نہ ہوتی، تو حیات میں دلکشی نہ ہوتی۔ زندگی کی کشاکش اور انبساط کا لطف حاصل نہ ہوتا۔ جہانِ کارزار میں فکر و عمل کے بغیر انسانی عظمت کا کوئی قائل نہ ہوتا۔ دنیا کی ساری رونق اور اس کے ہنگامے مرنے کے لئے جینے یا جینے کے لئے مرنے پر موقوف ہیں ؂

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

غالب کی شاعری میں حسن، نشاط اور حوصلے کی دلکش تصویر بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے ہاں داخلی و خارجی کیفیات یکساں ہیں۔ غالب کی زندگی غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا حسین امتزاج ہے۔ ان کے نزدیک غمِ عشق کے بغیر غمِ زندگی خام ہے۔ اُن کے پاس جس شدت سے غمِ عشق کا جذبہ کارفرما ہے۔ اسی شدت سے انکارِ حیات بھی غالب ہے۔ وہ ان ہی کیا جس کے دل میں درد نہ ہو۔ درد کا مزا غم خوردہ دل ہی پا سکتا ہے۔ عشق کی بدولت ہی خواہ وہ حقیقی ہو یا مجازی طبیعت زندگی کی اصل لذت سے آشنا ہو سکتی ہے۔ ؂

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

لفظی صنعت گری بھی غالب کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی جدت طرازی کے باعث شعر میں ایک کشش ایک تاثر پیدا ہو جاتا ہے۔ ؂

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غالب صوفی شاعر تھے۔ مذہبی تصوف سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ لیکن وہ اکثر اپنے اشعار میں صوفیانہ خیال اور مسائلِ تصوف بیان کرنے کی کوشش کرتے تھے جس کی وجہ سے فلسفۂ تصوف کے بعض اہم نکات غزل کی وسعت کا باعث بن گئے۔ کہیں کہیں عارفانہ رنگ بھی ہے۔ اور غزل کے مزاج نے اس رنگ کو بھی قبول کیا ہے۔ غالب نے ایک نئے انداز سے غزل میں مسائلِ تصوف بیان کئے۔ اگر بادہ خواری کے عادی نہ ہوتے تو اُن کے ولی ہونے میں کوئی کلام نہ تھا۔ اندازِ بیان یا ایک جادو ہے۔ ایک سحر کاری ہے۔ کہتے ہیں۔ ؂

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

سیدھی سادی بات کو اگر سلیقے اور ڈھنگ سے کہا جائے تو نہ وہ صرف معنی خیز بن جاتی ہے بلکہ دل پر اس کے تاثیر بیٹھ جاتی ہے۔ غالب کے ہاں بات کہنے کا ایک سلیقہ ہے ایک ڈھنگ ہے ایک انداز ہے اس انداز و ادا کی گہرائی میں اثر ہو جاتی ہے۔ ذہنوں پر چھا جاتی ہے۔ اس میں غالب کی ذہانت، ذکاوت اور شخصیت کو ...

موضوع کی ظرافت، شگفتگی اور طرزِ ادا کو بڑا دخل ہے۔ اس پر مولانا حالی کا یہ قول صحیح ہے کہ ... ملتا ہے۔ ... مضمون اور اس کا ایک ... سر ... اور اس کی ... بات

نکلا تو یہ امر یقینی ہے کہ دیکھئے۔

۳۔ غالب کا اپنی ذات کو صیغۂ غائب سے تعبیر کرنے میں یہ راز ہے کہ شدتِ محبت کے باعث وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ آیا غالب میں ہی ہوں یا کوئی اور۔

۴۔ ایسی حالت میں غالب بتا رہا ہے کہ اس کی فریاد، اطراف و اکنافِ عالم کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

۵۔ بستیوں سے جہاں کو تعبیر کرنے میں یہ مصلحت ہے کہ ویرانے تو ویرانے ہی ہیں۔

۶۔ وہ کیا دشت و ویرانہ ہو گئے اور فرق کچھ نہیں ہو [illegible] کیونکہ اس کے لئے بہاری [illegible] اور بستی اور ویرانہ متضاد بھی ہیں۔

۷۔ مستقبل کو ماضی کے صیغہ سے ادا کرنا یہ حقیقت ہے کہ آگے جو ہونا ہے گویا کہ ہو چکا اور اس میں کوئی شک شبہ نہیں۔

پروفیسر سید حسن

نذرِ غالب

("ہوں گل فروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز" ۔ غالب)

غالب ترا کلام ہے جانِ سخن ہنوز
لفظوں سے تیرے مست ہے ہر انجمن ہنوز

ثانی ترا جو دہر میں ایسا کوئی ملا
دن رات جستجو میں ہے چرخِ کہن ہنوز

تھا آگرے کا لال تو دہلی کا اک چراغ
ضو دے رہا ہے تجھ سے بعد فنا کے چمن ہنوز

تیرے ہر ایک شعر میں کتنی ہے سادگی
چھڑکے ہے جان عشاق سے مشکِ ختن ہنوز

کیا کیا ہوئی غزل میں وہ جدت طرازیاں
مقبول عام و خاص ہے تیرا ہی فن ہنوز

سو حال سے ہے کوشش تقلید گو بہت
پایا کسی نے بھی نہ ترا بانکپن ہنوز

تیری زمیں میں شعر بھلا کب وہ کہہ سکیں
مشقِ سخن ہی خام ہے سید حسن ہنوز

ڈاکٹر پروفیسر [illegible] الدین

غالب کا فلسفۂ حیات

بقول رشید احمد صدیقی "مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا۔ غالب، ہندوستانی زبان اور تاج محل! یہ ہندوستان کی تہذیب میں پیدا ہوئے اور ہندوستان کے سوا کہیں اور ظہور نہیں پا سکتے تھے۔ ان تینوں میں ہندوستان کے صوری اور معنوی امتیازات جھلکتے ہیں۔"

حقیقت میں آل احمد سرور کے الفاظ میں "ہندوستانی میں پہلی بھرپور اور رنگا رنگ شخصیت غالب کی ہے۔" غالب کی شاعری میں اگرچہ فلسفیانہ مزاج ملتا ہے۔ لیکن اس سے تصوف یا روحانیت کا کوئی پہلو خاص طور پر نمایاں نہیں ہوتا۔ فکر، خوف و رجا، آرزو، مسرت و حسرت کی رنگا رنگی جھلکتی رہتی ہے۔ غالب کی شخصیت اس رنگین شخصیت کے مشابہ ہے جو مذہبی اور اخلاقی سہاروں کی بجائے انسانی سہاروں کی تلاش و جستجو کرتی رہتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بقول مسعود حسن انسان اور ادب پہلی دفعہ بے سہارے اپنی عظمت کے بل بوتے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ غالب کا کلام ایک طرف انسانی شخصیت کی پیچ داریوں میں روشنی دکھاتا ہے تو دوسری جانب ماضی پرستی سے روکتا ہے۔ ایک طرف انفرادیت کی تعلیم دیتا ہے تو دوسری جانب زندگی کی تکلیفوں پر کڑھنے اور کراہنے کی بجائے ایک حوصلہ عطا کرتا ہے۔ "غالب نامہ" کے مصنف اکرام بجا فرماتے ہیں کہ غالب کی نظر انسانی زندگی کے ان حقائق پر پڑتی ہے۔ جن کی طرف عام طور سے خیال نہیں کیا جاتا۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

مرزا غالب کے نظریۂ حیات میں سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے غمِ عشق اور غمِ روزگار کو غمِ حیات کے لئے لازم قرار دیا ہے کیونکہ یہی وہ غم ہے جو زندگی کو اپنے عظیم ناممکنہ منزلوں میں پہنچاتا ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

مرزا غالب انسان کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ بارِ عشق کو اٹھائے اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے مشکلات اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرے۔ کیونکہ دنیا میں اور بھی کئی آلام ہیں۔ جن سے انسان کو دوچار ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کی زندگی کا دامن غم و الم سے پاک نہیں ہے۔ اور زندگی کا لطف مشکلات سے مقابلہ کرنے میں ہے۔ تاہم زندگی کے تلخ تجربوں نے انہیں اس نتیجے پر پہنچایا کہ رفع مشکلات انسان کے بس کی چیز نہیں۔ اور زندگی میں تمام طور پر ایسے مواقع آتے رہتے ہیں۔ جہاں انسان کو قضا و قدر کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ مرزا غالب زندگی کی تلخیوں کو اس کا جزو لاینفک تصور کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ زندگی کے رنج و الم اور حزن و ملال سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ ان سے نجات پانے کے لئے ترکِ دنیا کی تلقین کرتے ہیں نہ علاج

دنیاوی سے علیحدگی کا درس دیتے ہیں اور نہ مردم بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ بلکہ وہ زندگی کا احترام کرتے ہیں۔ اور ان کی نگاہ میں زندگی ایسی نہیں ہے کہ جس سے نفرت کی جائے جو قنوطیت کی بنیاد ہے۔ بلکہ زندگی کی افادیت و اہمیت کو وہ اس طرح واضح کرتے ہیں۔ ؎

مٹتا ہے وقت فرصت ہستی کا غم کہیں
عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

کبھی انسانی زندگی کی عظمت اور قدر و منزلت کو وہ اس انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ؎

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

اور کبھی نظریہ زندگی کو جو دلی کیفیات کی تابع ہے اور جو زمانے اور ماحول پر منحصر ہے۔ انتہائی غم انگیز طریقے پر بیان کرتے ہیں۔ ؎

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

غرض یہ کہ غالب کا غم صحیح معنوں میں اس صحت مند انسان کا حزن و ملال ہے۔ جسے دنیا و مافیہا کی ہر چیز عزیز ہے لیکن مسلسل سعی کے باوجود اگر حاصل نہ ہو تو ملال نہیں ہوتا اور انتہائی مایوسی میں بھی قنوطیت کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے مصائب و آلام کا استقبال کرتا ہے۔

؎ رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ دنیا میں کسی چیز کو ثبات نہیں۔ انسان پیدا ہوتا ہے مرنے کے لئے عمارتوں کی تشکیل ہوتی ہے تخریب کے لئے۔ پھول کھلتے ہیں مرجھانے کے لئے غرضیکہ دنیا کی ساری چیزیں وجود میں آتی ہیں فنا ہونے کے لئے۔ یہی تعمیر و تخریب حیات و موت بقا و فنا لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں غالب فرماتے ہیں۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

مرزا غالب کے فلسفے کے ارتقا کا سراغ وہاں ملتا ہے جہاں روح کا تعلق خدا کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور جہاں انسان انفرادی زندگی کھو کر حیات ابدی حاصل کرتا ہے۔ اصل میں غالب حیات بعد ممات کے قائل نظر آتے ہیں۔ ؎

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

مرنے کے خیال میں انسان کو اپنی زندگی پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ فرماتے ہیں۔ ؎

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ غالب زندگی کو سمجھنا چاہتے تھے۔ اس سے ان کے احساس میں ایک تڑپ تھی۔ لیکن جس طرح سمجھنے کی کوشش کرتے تھے کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کی بیزاری اور بے یقینی اسی کا نتیجہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں۔ ؎

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

اور اصل میں غالب زندگی اور فلسفے کی تعبیر کو سمجھنے میں کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ اسی سے ان میں بیزاری، بے اطمینانی اور بے یقینی کے ساتھ شک اور شکست خوردگی کا احساس پیدا ہو گیا۔ اور بقول احتشام حسین "اس انفرادی کرب نے انہیں تشکیک، مزاج اور قنوطیت تک بھی پہنچا دیا۔ اور یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ؎

خوشی جینے کی کیا مرنے کا غم کیا
ہماری زندگی کیا اور ہم کیا
اک روز کا رونا ہو تو رو کر صبر آئے
ہر روز کے رونے کو کہاں سے جگر آئے

بہر کیف مرزا غالب کے فلسفۂ حیات کی بنیاد اس نقطہ پر ہو گئی؟ کہ وہ شناسی و غم کو اہمیت تو دیتے ہوئے بھی زندگی کو فطری سمجھتے ہیں۔